۱۲۶۰
قدامت روح و مادہ
تناسخ

اِنّہ خالق من کل شئ وھو الواحد القہار
ولقد خلقکم اطوارا

قدامت روح و مادّہ

اور

تناسخ

مولفہ
منشی برکت علی صاحب
سکرٹری انجمن احمدیہ شملہ

سنہ ۱۳۲۹ھ مطابق سنہ ۱۹۱۱ع

مطبوعہ رفاہ عام سٹیم پریس لاہور

انٹروڈکشن

اگست ۱۹۰۴ء میں آریہ سماج شملہ کی گھاس پارٹی نے ایک رقعہ ہمیں اس مضمون کا لکھا کہ ہم تم سے بعض اختلافی مسائل میں دوستانہ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ گو بعض احباب نے اس خیال سے کہ آریہ لوگ عموماً منھ زور ہوتے ہیں اور جب انہیں جواب نہ سوجھے تو بد زبانی پر اُتر آتے ہیں۔ اِس دعوت کے قبول کرنے میں تردد کیا۔ مگر جب دیکھا کہ چند ایک دوست بہت شوق رکھتے ہیں اور مستعد ہیں کہ اِن کے دلائل کا پبلک کے سامنے قلع قمع کر کے دکھائیں۔ بالاتفاق اُسے منظور کر لیا۔ چنانچہ سنیچر کی شام کو ہفتہ وار آریہ سماج کے اپنے مکان میں بحث کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ گو ان اجلاس کا پریزیڈنٹ ایک آریہ پلیڈر تھا۔ اور اُن کے سالانہ جلسہ کی وجہ سے بہت سے لائق و فائق آریہ مہاشے باہر سے آئے ہوئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمارا پہلو کسی طرح کمزور نہیں رہا۔

سب سے پہلا مضمون قدامتِ روح و مادّہ تھا۔ جس کو ایک احمدی بھائی نے شروع کیا۔ اور قرآن مجید سے چھ منطقی دلائل دیکر ثابت کیا کہ روح اور مادہ ازلی و ابدی نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ یہ ایک زبردست مضمون تھا جس کو سُنکر سامعین دنگ رہ گئے۔ اِس کا جواب تو کیا ہو سکتا تھا۔ مگر ایک آریہ کلمہ طیبہ کے اُلٹ پلٹ معنی کر کے اناپ شناپ بکنے لگا۔ اس پر ایک غیر احمدی مسلمان کو طیش آگیا۔ چنانچہ اُس نے اُٹھ کر کہا کہ یہ تہذیب سے

بعید ہے۔ اگر تمہیں جواب نہیں آتا تو خاموش ہو رہو۔ فضول اور بیہودہ بکواس اچھی نہیں۔ اگر زیادہ بولے تو اچھا نہیں ہوگا۔ بمشکل اس جھگڑے کو فرد کر کے بحث کو شروع کیا گیا۔ اِس جھگڑے سے الحمد للہ اتنا فائدہ تو ضرور ہو گیا کہ آیندہ کے لئے آریوں نے قدرے نرمی اختیار کر لی۔ اور قریباً چار ماہ تک سلسلۂ بحث قائم رہا۔ اِس عرصہ میں دو چار مضامین پر طبع آزمائیاں ہوئیں۔ جن میں سے تناسخ اور گوشت خوری کو خاص طور پر میں نے اپنے ذمہ لیا۔ مگر میں اور دوستوں کے خلاف اپنی ابتدائی تقریریں قلمبند کر لیتا تھا۔ جس سے میرے پاس ایک ذخیرہ تحریر کا ہو گیا۔ یہ تحریریں میرے پاس تب ہی سے پڑی ہوئی ہیں کچھ عرصہ ہوا کہ ایک مہربان نے میرے گوشت خوری کے مضمون کو دیکھا تو اُسے پسند فرمایا اور مشورہ دیا کہ اِس کو شائع کرادو۔ میرا پیشتر بھی کچھ ارادہ تھا جو اس مشورہ سے پختہ ہو گیا۔ چنانچہ میں نے سال گذشتہ کے اخیر میں اُس کو ایک رسالہ کی شکل میں چھپوا دیا۔

اب اِس خیال سے کہ دوسرا مضمون بھی محفوظ ہو جائے اور ممکن ہے کہ کسی کو اِس سے فائدہ پہنچے۔ میں اُس کو شائع کرا دیتا ہوں۔ اس میں تھوڑا سا حصہ روح اور مادہ کے ازلی ہونے کے متعلق ہے۔ مگر زیادہ تر بحث تناسخ کی ہے۔ اصل میں بحث تو قدامتِ روح و مادہ سے شروع ہوئی تھی۔ مگر بعد میں وہ تناسخ پر جا پڑی اور اُسی پر جرح و قدح ہوتی رہی۔ میں مضمون مذکور کو من و عن جیسا آریوں کے جلسے میں پڑھا گیا۔ پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ جس سے ناظرین کو علاوہ دلائل عقلی و نقلی کے جو پیش کئے گئے۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح آریہ لوگ جب ان کے پاس کوئی جواب نہ ہو تو شاخوں میں پڑ کر اصل مضمون کو

گم کر دیتے ہیں۔

میں نے اپنی دوسری تقریر میں ماسٹر آتمارام صاحب کے آٹھ دلائل میں سے چار کو عمداً چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ وہ مضمون زیر بحث کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مگر میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کے جوابات کو رسالہ ہذا میں بطور ضمیمہ شامل کر دیا جائے۔ تاکہ اول تو رسالہ مکمل ہو جائے۔ اور دویم ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ عقاید اسلام پر جو آریہ لوگ بعض اعتراضات کر دیتے ہیں وہ محض لاعلمی اور کوتاہ اندیشی پر مبنی ہوتے ہیں۔

برکت علی

۳۰۔ اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علےٰ رسولہ الکریم

تقریر اوّل

حاضرین جلسہ۔ پیشتر اس کے کہ میں مضمون زیر بحث کی طرف توجہ کروں۔ میں بطور تمہید کے چند کلمات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ

یہ مباحثہ مذہبی مباحثہ ہے۔ ایک طرف ہم ہیں اور دوسری جانب آریہ مت کے پیرو۔ لہٰذا ہماری بحث مذہبی اصولوں پر ہے اور ہم نے یہ امتیاز کرنا ہے کہ پیش کردہ اصولوں میں سے سچا کون ہے۔ مگر واضح رہے کہ چونکہ ہر دو جانب کے اصول ایک کتاب کی بنیاد پر ہیں جس کو وہ آسمانی سمجھتے ہیں۔ ہم نے ساتھ ہی اس بات کا بھی فیصلہ کرنا ہے کہ کہ ہر دو کتب سماوی میں سے فضیلت کس کے ساتھ ہے۔ فضیلت کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ مگر مضمون زیر بحث کے متعلق فضیلت کا یہ پہلو ہے کہ جس کتاب سے دعوے پیش

کیا جائے۔ دلائل بھی جہاں تک ہو سکے اُسی تلاش کیے جائیں۔ اگر کافی دلائل پیش کرنے سے کوئی کتاب قاصر رہے۔ تو ثابت ہوگا کہ فضیلت کا یہ پہلو اُسکا کمزور ہے۔ کیونکہ یہ تو ثابت ہے کہ جو کتاب نرا دعوے ہی دعوے پیش کرتی ہے اور اُس دعوے کی تصدیق میں کافی دلائل بیان نہیں کرتی۔ وہ ہم سے تحکم کے طور پر ایک بات منوانا چاہتی ہے۔ اور یہ ہر دانا سمجھ سکتا ہے کہ بلا دلیل دعوے جو تحکم سے منوایا جائے اُس میں صداقت کس درجہ تک ہو سکتی ہے۔

اس خیال سے ہم نے یہ التزام کیا تھا کہ جو دلیل عقلی پیش کی جائے اُس کے ساتھ قرآنی آیت بھی بیان کی جائے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارا عقیدہ کتابی حکم کے لحاظ سے صرف تحکم نہیں ہے۔ بلکہ جس کتاب نے ہمیں یہ عقیدہ سکھایا ہے کہ روح اور مادہ مخلوق ہیں۔ اُسی نے ثبوت بھی بہم پہنچائے ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہے کہ ہماری طرف سے جو ابتدائی تقریر ہوئی اُس میں کس خوبی کے ساتھ اس اصول کو بنھایا گیا۔ ہمارے آریہ دوستوں کو چاہیے تھا کہ اس کے جواب میں پیش کردہ دلائل کو ایک ایک کر کے لیتے اور عقلی طور پر اُنکی تردید کرتے۔ اور تصدیق میں اپنی کتاب سے یکے بعد دیگرے شُرتی بیان کرتے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ بلکہ اُن سب دلائل کو نظرانداز کر کے صرف ایک ہی بات پر زور دیا گیا۔ یعنی جب کچھ تھا ہی نہیں تو یہ روح اور مادہ آ کہاں سے گئے۔ حالانکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ پہلے جو دلائل اِس بات کے ثبوت میں دئے جاتے ہیں کہ روح اور مادہ مخلوق ہیں۔ ان کو باطل ٹھیرایا جائے۔ عقلی طور پر جس طرح میں نے بیان کیا ہے۔ پھر یہ سوال کیا جائے کہ نیست سے ہست کس طرح ہو سکتا ہے۔ اِس کا جواب اپنے موقعہ پر دیا جائے گا۔

ایک اور طریق جو ہمارے مخالفین کی طرف سے ظہور میں آیا اور جو قابل تردید ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنی طرف سے ایک خیال ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے اور اُس پر نکتہ چینی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک صاحب اُٹھ کر فرماتے ہیں کہ "دیکھو باوجودیکہ تم اقرار کرتے ہو کہ خدا واحد ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں۔ مگر کلمہ توحید میں حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ ملاتے ہو۔ پبلک جانتی ہے کہ یہ طریقہ بحث کا نہیں ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم اس بحث میں شریک اس خیال سے ہوئے تھے کہ سب تعلیم یافتہ اور شریف طبع انسان ہیں۔ اُن سے ایسی ناشائستہ حرکات سرزد نہیں ہوں گی۔ اور اس پر ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ بحث دوستانہ طریق پر ہوگی۔ یعنی ناجائز حملے نہیں کئے جائیں گے۔ گو اس حرکت کا دفعیہ کردیا گیا ہے۔ مگر میں نے اس بات کو اس واسطے دوہرایا ہے کہ آیندہ کے لئے اس قسم کی بحث سے اجتناب کیا جائے۔ اور دوسری میری غرض یہ ہے کہ آریہ صاحبان کو واضح طور پر سمجھا دوں کہ کلمہ طیبہ کے کیا معنی ہیں۔ تاکہ آیندہ اُنہیں یہ دھوکا نہ لگے کہ حضرت نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کا نام کلمہ میں ہونے سے خدا تعالیٰ سے شرک لازم نہیں آتا۔ کلمہ طیبہ کے معنی وسیع اور عمیق ہیں۔ اور نکتہ رس اور معرفت شناس لوگ اس سے عجیب در عجیب حکمتیں اور فضیلتیں نکالتے ہیں۔ مگر میں وہ معنی کرتا ہوں جو سیدھے اور صاف ہیں۔ وہ یہ ہیں کلمہ طیبہ ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یعنی اس کے بتین یہ ہیں "نہیں ہے کوئی معبود سوائے اُس معبود کے۔ اور محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس معبود کا رسول ہے یعنی پیغام پہنچانے والا"۔ مطلب صاف ہے کہ معبود حقیقی ایک ہی ہے اور وہ وہ ہے جو متصف بجمیع صفات کاملہ فاضلہ ہے اور اُس کے سوائے کسی میں وہ صفات نہیں۔ لہٰذا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ اور محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو رسول ہے تو اُسی معبود حقیقی

کا ہے لہٰذا اس کی سب باتیں سچ ہیں - اور اُن میں دروغ کی آمیزش نہیں اور چونکہ وہ رسول
ایسے قادر مطلق کا ہے - کوئی اُس پر غلبہ نہیں پا سکتا اور وہ سب پر غالب آجائے گا - یہ
ہیں معنی کلمہ طیبہ کے سیدھے اور صاف - جو ہم سمجھتے ہیں - کوئی اور معنی بے معنی لے کر
ہماری طرف منسوب کرنا اور پھر اس پر نکتہ چینی کرنا نادانی ہے - اگر ہم الزامی جواب کی طرز پر
یہ کہیں کہ دیکھو گو وید میں ایک پرمیشر کی پرستش بیان کی جاتی ہے مگر ساتھ ہی ہوا - آگ -
سورج - سینکڑوں اشیا کی پرستش سکھائی جاتی ہے - پس مشتے نمونہ از خروارے
ثابت ہوا کہ ایسی کتاب فضول اور ناقابل عمل ہے - مگر یاد رہے کہ یہ بحث کا طریق نہیں -
آریہ صاحبان نے ان شرتیوں کی جنکی عبارت میں نقل کر سکتا ہوں اور جن میں صاف
الفاظ میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مخلوق اور مادی اشیاء سے دعائیں مانگی گئی ہیں - بے شک
تاویل کرنی ہوگی - پس ہمیں اس قسم کے اعتراض سے کیا فائدہ - ہم نے تو جو عقیدہ
ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے - اُس پر عقل دوڑانی ہے اور دیکھنا ہے کہ وہ صحیح
ہے یا غلط -

ایک اور طریق بحث جو ایک صاحب نے اختیار کیا تھا اور وہ بھی قابل تردید ہے -
وہ یہ ہے کہ وہ اُٹھتے ہیں اور ہمارے اُستاد بن کر ہمیں سمجھاتے ہیں کہ اگر تم نے یہ سمجھنا
ہے کہ خدا خالق روح اور مادّہ کا نہیں - تو تمہیں چاہئے کہ کن فیکون کی تفہیم کو دل سے
اُٹھا دو اور پھر بحث کرو - چہ خوش - ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ یہ ایک زیرک انسان معلوم ہوتے
ہیں - کوئی پختہ دلیل پیش کریں گے کہ روح اور مادہ مخلوق نہیں - مگر وہ چاہتے ہیں کہ ہم بلا دلیل
اپنے عقیدہ کو چھوڑ دیں - یا شاید یہ بھی کوئی روح اور مادہ کے ازلی و ابدی ہونے کی دلیل
ہوگی - جس کو ہم نہیں سمجھتے - مگر میں جانتا ہوں کہ کوئی صاحب اِس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا

کہ یہ بھی کوئی روح اور مادہ کے مخلوق نہ ہونے پر دلیل ہے۔ اور اس پر لطف یہ ہے کہ نہیں اتنا بھی مادہ نہیں کہ جب ہم نے اپنے عقیدہ کو ترک کردیا اور بلا دلیل تسلیم کرلیا کہ روح اور مادہ ازلی ہیں۔ تو پھر بعد اس کے بحث کس بات پر کریں ہم نے تو اپنا عقیدہ پیش کیا ہے اور اس پر از روے منطق دلیلیں دی ہیں۔ اگر حق کی تلاش ہے۔ تو ان دلیلوں پر غور کرو اور بعد اس کے ان کی تصدیق کرو یا اسی طرح از روے منطق ان کی تردید کرو۔ اگر یہ دو باتیں نہیں۔ تو بحث فضول ہے اور اس سے کوئی نیک نتیجہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ بھلا اگر ہم کہیں کہ اے صاحبان۔ افسوس ہے کہ آپ کو خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر یقین نہیں۔ وہ وہ قادر مطلق ہے جسے کوئی چیز پیدا کرنے کے لئے ہماری طرح اسباب کی ضرورت نہیں۔ وہ تو محض اپنے ارادے سے سب کچھ ظہور میں لاسکتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ اس حق سے کچھ فائدہ اُٹھائیں۔ تو آپ کو چاہئے کہ تعصب کو دور کرکے اور یہ وہم دل سے اُٹھاکر کہ خدا ہماری طرح محتاجِ اسباب ہے۔ ہمارے سامنے آئیں اور بحث کریں۔ دیکھو آپ کو خود ہی یقین آجائے گا کہ واقعی خدا ایسا ہی خدا ہے۔ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم بحث کے وقت تو ضرور اس خیال باطل کو چھوڑ دیں۔ کتابی عقیدے سے بالکل برطرف ہوجائیں اور عقل کی رو بات کریں۔ تو دیکھئے کس طرح سب معاملہ صاف ہوجاے گا۔ اگر ہم یہ آپ سے مطالبہ کریں تو سب ہنسیں گے اور کہیں گے کہ یہ عجیب منطق ہے۔ جس عقیدے کو آپ دلائل سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اُس عقیدے سے تو آپ کو روکا جاتا ہے پھر بحث کس بات کی نہیں یہ نہیں۔ بلکہ ہم دو نو پارٹی مذہب رکھتے ہیں۔ لامذہب نہیں ہیں اور ہمارے عقائد اپنی کتب سماوی پر مبنی ہیں۔ ہم نے یہ پرکھنا ہے کہ از روے عقل ہر دو عقائد میں سے کون ماننے کے لائق ہے۔ بے شک بات تو یہی ہو کہ خدا ایسا ہی قادر مطلق

ہے کہ اُسے کسی چیز کو جو اس کے ارادے میں آئے۔ عدم سے وجود میں لانے کے لئے کسی اسباب کی ضرورت نہیں۔ مگر ہم نے یہ دلائل سے ثابت کرنا ہے اور اس کا ثبوت اپنے موقعہ پر دیا جائے گا۔

اسی صاحب نے ایک اور حرکتِ ناشائستہ یہ کی کہ ایک عربی فقرہ پڑھا اور ہمیں سمجھایا کہ دیکھو گو تم کہتے ہو کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہرگز شرکت نہیں ہو سکتی۔ مگر تمہیں یہ تعلیم دیجاتی ہے کہ اخلاق اللہ کے ساتھ شرکت پیدا کرو مجھے اس بات سے بحث نہیں کہ انہیں عربی نہیں آتی اور وہ عربی عبارت تک درست نہیں پڑھ سکتے۔ مگر اتنا تو ضرور ہونا چاہیے تھا کہ وہ معانی تو درست بتا دیتے۔ وہ عربی فقرہ یہ ہے تشبہ باخلاق اللہ اور یہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ صحیح طور پر حدیث شریف کے الفاظ کیا ہیں مگر اس فقرہ میں شرکت کا لفظ تک نہیں۔ معلوم نہیں کہ اُنہوں نے یہ معنی کس طرح سمجھ لئے کہ اخلاق اللہ کے ساتھ شرکت پیدا کرنی ہے۔ معنے اس کے صاف یہ ہیں کہ اخلاق الٰہی کے ساتھ مشابہت پیدا کرو۔ یعنے اخلاق اللہ کریم۔ رحیم۔ غفور وغیرہ جو ظلی طور پر انسان میں بھی پائے جاتے ہیں اور اُسکی فطرت میں ودیعت کیئے گئے ہیں۔ ان میں ترقی کرو تا تم فلاح پاؤ۔ ہم نے ایک مشابہت حاصل کرنی ہے۔ اور مشابہت جو ہوتی ہے ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ وہ کسی چیز کا عین نہیں ہوتی۔ اور جو چیز دوسری چیز کی عین نہیں۔ وہ اسکی شریک نہیں۔ مگر روح اور مادہ کے ازلی ماننے میں ایک شرکت عینی ماننی پڑتی ہے جو ہم گوارا نہیں کر سکتے۔ ایک مناسبت پیدا کرنے سے مشارکت نہیں آتی۔ یہ بات کہ کسی صفت میں کوئی اُس کا شریک نہیں ہو سکتا۔ ضمن بحث میں بخوبی ثابت کیجائیگی۔

ایک صاحب نے ہمارے دلائل کی تردید میں یہ کوشش کی کہ زید و بکر کی راے

پیش کر کے یہ چاہا کہ ہم بھی اُس کے ساتھ اتفاق کریں۔ اول تو یہ کہ اُنہوں نے جو اپنے زعم میں معنے سمجھے وہی غلط تھے۔ اور اگر وہ معنے صحیح بھی سمجھیں تو ہمیں غیر کی راے سے کیا غرض۔ آپ کو تو چاہئیے کہ آپ ہمارے عقائد کی تردید میں دلیل عقلی پیش کریں۔ اور جس طرح ہم نے دلائل منطقی سے ثابت کیا ہے کہ روح اور مادہ مخلوق ہیں۔ آپ اُسی نہج پر ثبوت بہم پہنچائیں کہ وہ ازلی ابدی ہیں۔ ادھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے سے کیا فائدہ آپ صاحبان خیال کرتے ہوں گے کہ یہ بات گول مول رہی۔ حقیقت کا پتہ نہ لگا کہ یہ مذموم طریق بحث کس نے برتا۔ سو میں واضح کر کے بیان کر دیتا ہوں۔ ایک صاحب نے دو شعر فارسی کے مولانا روم اور شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہما کے پڑھ کر سنائے اور اُس سے نتیجہ نکالا کہ وہ تناسخ کے قائل ہیں۔ اس سے مطلب ان کا غالباً یہ تھا کہ بعض مسلمان بھی تناسخ کے قائل ہیں۔ پس ہمیں بھی اس مسئلہ پر صاد کر دینا چاہئیے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ میں نے یہ سُنا کہ بعض مسلمان بھی تناسخ کو مانتے ہیں۔ اور میں حیران تھا۔ مگر ہمارے ایک دوست نے اُٹھ کر اُنہیں سمجھا دیا کہ جو مطلب اُنہوں نے سمجھا غلط تھا اور اس کے کچھ اور معنے ہیں جس سے مسئلہ تناسخ کو جس طرح پر آریہ صاحبان مانتے ہیں کچھ تعلق نہیں۔ تو خیر اول تو انہوں نے معانی غلط سمجھے اور دوسرے اگر کوئی تناسخ کو مانتا بھی ہو۔ تو یہ کون سی دلیل ہے کہ ہم بلا تفتیش اُس کو حق مان لیں۔ اور پھر ہمارے سامنے مسئلہ تناسخ کو روح اور مادہ کے ازلی ابدی ہونے پر بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ جب ہم تناسخ کے قائل ہی نہیں۔ تو پھر ہمارے واسطے یہ دلیل کس طرح قائم ہو سکتی ہے۔ مسئلہ تناسخ خود محتاج ثبوت ہے۔ اور اس کے باطل ہونے پر ہمارے پاس اس قدر قوی دلائل ہیں کہ ہم اس کو ممکن الصحیح بھی نہیں مان سکتے۔ بحث کے واسطے یہ ضروری امر ہے کہ دلیل وہ پیش کیجائے۔ جو عقل عامہ کے مطابق ہو یعنی یہ صاف سمجھا جائے کہ وہ

دلیل ہے۔ بے تعلق گفتگو سے کچھ فائدہ نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ زید و بکر کی رائے ہماری طرف منسوب نہ کیجائے۔ اور اگر کوئی ضمن میں ایسی بات آپڑے۔ تو آپ ہم سے دریافت کر سکتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ با اصول کیا ہے۔

اسی بحث کے درمیان ایک اور آریہ صاحب نے ایک عجیب دلیل اس بات پر دی کہ روح اور مادہ ازلی ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے تبلایا کہ یورپ اور امریکہ میں بہت سے لائق عیسائی ہندو فلسفہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بڑی دلچسپی سے اسمیں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اچھا سمجھتے ہیں۔ کیا یہ بھی کوئی دلیل ہے۔ کون نہیں جانتا کہ آج ممالک غربیہ میں علم کا خوب چرچا ہے اور وہ ہر ملک اور مذہب کی کتابیں ترجمہ کرتے اور پڑھتے ہیں۔ اور اس سے اپنے علم کو وسعت دیتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عربی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے ہیں۔ بلکہ اس بات میں اسلام کو زیادہ فخر ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے اور بعین صحیح ہے۔ بلکہ انگریزوں نے۔ ہاں عیسائیوں نے۔ اس کا اعتراف⊗ کیا ہے کہ انہوں نے جمیع علوم مسلمانوں سے لئے۔ جب عیسائیوں کی ترقی کا زمانہ شروع ہوا۔ اُسوقت ہندوستان تاریکی کی حالت میں تھا۔ اور مسلمان ہر پہلو سے بہبودی کی حالت میں تھے۔ عیسائی دور دراز کے ملکوں سے آتے تھے اور علم حاصل کر کے جاتے تھے۔ اور اپنی قوم میں پھیلاتے تھے۔ اور ادھر سے مسلمان ان کے ملکوں میں سفر کرتے تھے۔ بتجارت یا دیگر اغراض کے باعث۔ جس سے اُن کو بہت فائدہ ہوتا تھا۔ اِس کے بعد جیسا زمانے کی چال ہے۔ جوں جوں مسلمان عیش و عشرت میں پڑکر غافل ہوتے گئے۔ ویسا ہی وہ ترقی کرتے

⊗ دیکھو سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۳۔ اگست ۱۹۰۹ء میں ای بی آئیون مسٹر صاحب کا لکچر (خلاصہ) جو انہوں نے ۱۲۔ جولائی ۱۹۰۹ء کو آل انڈیا مسلم لیگ لندن کی میٹنگ میں پڑھا۔ ۱۲

گئے - اور ان کے ہاتھ سے سب ترقی کے سامان دوسری جانب منتقل ہو گئے اور
اب بھی جس تعظیم و تکریم سے اسلام کی اخلاقی تعلیم دیکھی جاتی ہے - اسکا ادنی ثبوت یہ ہے
کہ جرمن میں قرآن شریف سکولوں میں درس کے طور پر پڑھایا جاتا ہے - غرض اس پہلو سے
بھی غور کیا جائے تو اسلام کا پہلو زبردست ہے - البتہ اسی کے متعلق ایک اور طرح پر دلیل
جم سکتی ہے - کہ آریہ دھرم کے اصول سچے ہیں - وہ ہمیں دکھائیں کہ کتنے انگریز یا عیسائی
فلاسفر اور سائنس دان آریہ یا ہندو ہو گئے ہیں - اس کے جواب میں شاید وہ تھیاسوفک
سوسائٹی کے ممبر پیش کریں - مگر واضح رہے کہ یہ سوسائٹی کوئی مذہبی سوسائٹی نہیں ہے -
ان کو کسی خاص مذہب سے لگاؤ نہیں - ان کا اصول ہے کہ سچ سے بڑھ کر کوئی مذہب
نہیں - پس وہ ہر مذہب سے کوئی نہ کوئی اصول لے لیتے ہیں جو انہیں سچا معلوم ہوتا ہے -
اور اُسی پر عمل درآمد کرتے ہیں - اس صورت میں ہندوؤں کے مذہب کے ساتھ کوئی
خصوصیت نہ رہی - شاید آپ یہ کہیں کہ گو انہیں آریہ دھرم سے خاص تعلق نہیں - مگر انہوں نے
بہت سے اصول اس مذہب سے لئے ہیں - مگر ہم کہتے ہیں کہ خیالی اصول گو لے لئے ہوں
مگر عملاً جو ہندو ہو گئے ہوں - انہیں پیش کیجئے - مثلاً آریہ دھرم کے پانچ بڑے اصول ہیں
ایک پرمیشر - دوسرا روح - اور تیسرا مادہ - ان تینوں کو ازلی و ابدی ماننا - چوتھا یوگ -
پانچواں   یہ پانچ اصول ہیں جن پر کاربند ہونے سے کوئی شخص آریہ کہلا سکتا ہے
پس اگر آپ کوئی عیسائی فلاسفر ہندو ہوا ہوا پیش کریں تو یہ بھی ساتھ ہی دکھلانا ہوگا کہ پرمیشر -
روح اور مادّہ کو ازلی ماننے کے ساتھ ہی وہ عقیدہ یوگ پر بھی عمل درآمد کرتا ہے - مگر یہ نہیں کہ
ایسا شخص پیش کریں جو صرف زبان سے اقرار کرتا ہے یا ایک ہی پہلو کا عامل ہے - کیونکہ ایسے
آدمی تو ہزاروں آج کل کے پرفساد زمانے میں مل سکتے ہیں جو یوگ کرنے کے لئے طیار

ہوں۔ مثلاً شرابی اور رنڈی باز سب کے سب خوش ہوں گے کہ کوئی ان سے نیوگ
کرائے۔ مگر نہیں شرط یہ ہے کہ وہ اپنی بہو بیٹیوں سے بھی نیوگ کرائیں۔ تب ہم انہیں
مانیں گے کہ وہ آریہ ہو گئے ہیں۔ غرض اس پہلو میں بھی مسلمان غالب ہیں۔ ہم دکھا سکتے
ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ انگلستان اور امریکہ میں سینکڑوں انگریز اور عیسائی مسلمان ہو گئے
ہیں۔ اور وہ برابر اسلامی طریقوں پر عمل کرتے ہیں۔ اور انہیں کسی کتابی حکم کے ماننے اور
اس پر کاربند ہونے سے شرم نہیں۔ وہ مسلمانوں کا ایمان رکھتے ہیں اور مانتے ہیں کہ خدا
واحد ہے اور ہر صفت میں یکتا ہے۔ وہ رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ فرشتوں۔
آسمانی کتابوں اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور عملیات میں نماز روزے کے پابند
ہین یعنی پورے مسلمان ہیں۔ وہ طلاق کے مسئلے سے جسکو آپ برا سمجھتے ہیں۔ نفرت
نہیں کرتے۔ بلکہ انہیں اس حکم کے ماننے میں جو مشروط بشرائط ہے۔ ہرگز دریغ نہیں۔ اگر انکی
منکوحہ بیوی فاحشہ ہو۔ وہ اُسے طلاق دیدیں گے۔ اگر انکی بیوی میں ایسے رذیلہ خصائل پیدا
ہو گئے ہوں جن کے باعث گھر میں فساد رہے اور ان کا کوئی دفعیہ نہ ہو سکے۔ تو وہ اس سے
دست بردار ہو جائیں گے۔ غرضیکہ اس بات کو بھی کہ دوسری قوموں میں خاص کر یورپ
اور امریکہ کے عیسائی فلاسفروں میں اسلام پھیل رہا ہے یا آریہ دھرم اس بات کو بھی اگر روح
اور مادہ کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کی دلیل ٹھیرایا جائے۔ تو ہمارا پہلو غالب ہے۔ مگر ایسے
دلائل کی ہمیں ضرورت نہیں۔ میں نے جو یہ قدرے بیان کیا ہے۔ تو صرف ایک آریہ
صاحب کے جواب میں اور اس غرض سے کہ آیندہ ایسی دلیلیں پیش نہ کی جائیں۔

غرض یہ چند کلمات جو میں نے تمہیدی طور پر عرض کئے ہیں۔ اس واسطے کئے ہیں کہ
بعض آریہ صاحبان نے ایسی باتیں بیان کی ہیں جنکا مضمون زیر بحث سے کچھ تعلق نہیں

اور مجھے یہ بھی جتلانا منظور ہے کہ ہم بھی اسی طرح اناپ شناپ بولنا چاہیں تو بول سکتے ہیں۔ مگر اگر بحث سے کچھ فائدہ اُٹھانا ہے۔ تحقیق حق مدنظر ہے۔ تو ہمیں چاہیے کہ اپنے دلائل اور تقریر مضمون مقررہ تک ہی محدود رکھیں۔ ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے سے اصلی مضمون گم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتے ہو صاف کہدیجئے۔ ہم آپ سے پیچھے تو پڑے ہوئے نہیں۔ آخر آپ ہی نے ہمیں بُلایا تھا کہ آؤ دوستانہ بحث سے لابھ اُٹھائیں۔ مگر اگر اس طریق پر بحث رہی۔ تو لابھ تو کیا بلکہ دل شکنی پیدا ہوگی۔ میں امید کرتا ہوں کہ آیندہ بحث میں بے تعلق تقریر سے اجتناب کیا جائیگا۔ اور جو طریق بحث میں نے پیش کیا ہے۔ اس پر غور کی جائیگی یعنے یہ کہ حتی الوسع عقائد کے ساتھ دلائل بھی اپنی اپنی آسمانی کتاب سے پیش کئے جائیں۔ اسمیں شک نہیں کہ محض عقائد جن کے ساتھ عقلی ثبوت نہیں۔ قابل پذیرائی نہیں ہو سکتے۔ مگر اگر سارے عقلی دلائل اسی کتاب سے مل جائیں تو نور٘ علےٰ نور ہوا اور اس سے اُس کتاب کی فضیلت زیادہ ثابت ہوئی۔ اگر اس تجویز پر آپ کو اعتراض ہے تو بیان کر دیجئے۔ ہم مجبور نہیں کر سکتے۔ ہم اپنی طرف سے اسی طریق کو مدنظر رکھیں گے۔ مگر اگر آپ اس طریق پر نہیں چلتے تو ثابت ہوگا کہ آپکی بحث کا یہ پہلو کمزور ہے۔

اِس تمہید کے بعد میں اصلی مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ واضح ہو کہ مضمون یہ تھا کہ عقلی دلائل سے ثابت کیا جائے کہ آیا روح اور مادّہ مخلوق ہیں یا نہیں۔ اس مضمون پر باجازت آریہ صاحبان افتتاحی تقریر ہماری طرف سے ہوئی تھی اور گذشتہ دو ہفتوں میں چھ* یا سات

* یہ دلائل حضرت مسیح موعود علیہ الصلوات والسلام کے اس مضمون سے لئے گئے تھے جسمیں انہوں نے پنڈت کھڑک سنگھ صاحب۔ سوامی دیانند صاحب۔ منشی اندرمن صاحب وغیرہ کو چیلنج دیا تھا۔ اور جو شیخ یعقوب علی صاحب ایڈیٹر الحکم نے ۱۸۹۹ء میں وہ حضرت اقدس کی پرانی تحریریں" کے نام سے شائع کیا۔ ۱۲

منطقی دلائل بیان کی گئی تھیں اور اُنکی موید قرانی آیات پیش کی گئی تھیں۔ جن میں یہ ثابت
کیا گیا تھا کہ روح اور مادہ ہردو مخلوق ہیں۔ اس کے جواب میں چاہئے تھا کہ آریہ صاحبان
یکے بعد دیگرے ان دلائل کو توڑتے اور پھر اپنی طرف سے ثبوت پیش کرتے کہ وہ ازلی و
ابدی ہیں۔ مگر پبلک جانتی ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایک دو موٹی باتیں پیش کر لسانی کی گئی
اور زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ نیست سے کوئی چیز ہست نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ یہ صاف
بات ہے کہ جب قرائن اس بات پر اتفاق کرتے ہیں۔ کہ روح اور مادہ مخلوق ہیں۔ تو پھر اس
بات کے پیچھے پڑنا کہ وہ کس طرح مخلوق ہوئے۔ نادانی ہے۔ کیونکہ ہم تو ناقص ہیں۔ اور ہماری
کل طاقتیں محدود ہیں۔ لہذا ہمیں راز ربانی جسمیں سب صفات کمال درجہ کی ہیں۔ کس طرح
سمجھ میں آسکتا ہے۔ علاوہ اس کے بعض صاحبان نے تناسخ کو روح اور مادہ کی ازلی
ہونے کی دلیل پیش کی ہے۔ مگر جب ہم اس مسئلہ کے قائل ہی نہیں تو ہمارے واسطے
یہ دلیل کیونکر قائم ہو سکتی ہے۔ لہذا اب دو مضمون آپڑے ہیں۔ جن پر بحث کرنی پڑی ہی۔
یعنی روح اور مادہ کا ازلی ہونا اور تناسخ۔ اوّل الذکر کی نسبت تو بہت کچھ بیان ہو چکا ہے۔
میں بھی اپنے خیالات ظاہر کروں گا۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تناسخ کی نسبت کچھ کہا جائے
لہذا واضح ہو کہ اسمیں شک نہیں کہ ایک حصہ دنیا کا اس مسئلہ کا قایل ہے۔ مگر اسمیں
بھی کچھ شبہہ نہیں کہ اُس سے زیادہ حصہ اس کا منکر ہے۔ اگر ہندو اور بدھ اسکو مانتے
ہیں۔ تو مسلمان اور عیسائی اسکو رد کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے یہ بھی کوئی دلیل نہیں کہ یہ
پرانا مسئلہ ہے اور ایک فرقہ میں مدت سے مسلم ہے۔ کیونکہ ایک غلطی کا مدت کا قائم رہنا
ممکن ہے۔ البتہ اگر عقلی دلائل اسپر عائد ہو سکیں۔ تو وہ صحیح مانا جا سکتا ہے۔

یہ مسئلہ دو طرح پر مانا جاتا ہے۔ ایک وہ گروہ ہے جو کہتا ہے کہ انسان مر کر اپنے

برے کرموں کے باعث کسی حیوان کی جون میں جاتا ہے۔ اِس کے بعد پھر انسانی جسم دیا جاتا ہے۔ اور پھر مر کر پھر حیوان بنایا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ ایک مدت دراز تک جاری رہتا ہے حتے کہ انسان مکتی پا جاتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جنہوں نے انسانی روح کا حیوانی جسم میں جانا لغو سمجھا ہے اور اس مسئلہ کو اِس طرح ترمیم کر لیا ہے کہ انسان جب مر جاتا ہے تو اسکی روح پھر انسان ہی کے قالب میں آتی ہے۔ اور گزشتہ بد افعالیوں کی اصلاح کر کے ترقی کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کدورت سے صاف ہو کر نجات پا جاتی ہے۔ مگر یہ نجات کی حالت ایک مدت تک ہے جب سب روحیں نجات پا جائیں گی۔ انکو از سرِ نو اِس دنیا میں آباد کیا جائیگا۔ اسی طرح یہ سلسلہ قائم رہے گا اور اس کا کوئی انتہا نہیں۔

میرا مضمون مسئلہ تناسخ کی ہر دو شاخوں پر حاوی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ جو صاحب غور سے سُنیں گے فائدہ اُٹھائیں گے۔ بنیاد اِس مسئلہ کی یہ ہے کہ دنیا میں جو یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ کوئی دولتمند ہے اور کوئی غریب ہے۔ کوئی عقلمند ہے تو کوئی بے وقوف سودائی ہے۔ کوئی لنگڑا لولا ہے اور کسی کے ہاتھ پاؤں درست نہیں۔ کسی کا حافظہ بڑا تیز ہے اور کوئی جلدی بات کو بھول جاتا ہے۔ کوئی نیک کاموں میں پڑا ہوا ہے اور کوئی بدیوں میں ہمہ تن مصروف ہے۔ تناسخ کے ماننے والوں نے دو ہی لفظوں میں فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ تمام تفرقہ کسی پہلے جنم کا نتیجہ ہے۔ اور ہم جزا و سزا گزشتہ اعمال کی بھوگ رہے ہیں۔ مگر ذرا غور کیا جائے اور مختلف پہلوؤں پر نظر کی جائے تو یہ خیال بدیہی البطلان معلوم ہوتا ہے۔

ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی نئی چیز باہر سے نہیں آتی۔ بلکہ موجودہ اشیا ہی تغیر و تبدل ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی ان کی روح بھی

گھومتی رہتی ہے۔ مگر اوّل تو پورے طور پر ثابت نہیں کہ ہر چیز چکر میں ہے۔ مثلاً زمین کے
وجود میں ایک تغیر ہے جس کے بعض حصّے ایک خاص الٰہی قانون کے ذریعہ مختلف
شکل کے ہوجاتے ہیں۔ کوئی سونا اور چاندی بن جاتا ہے۔ کوئی پتھر ہیرا لعل وجواہر جنمیں
مٹّی کے خواص تک مفقود ہوجاتے ہیں۔ پس کوئی کہہ سکتا ہے کہ تناسخ کا چکر انکو بھی کبھی
مٹّی بنا دیتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ پھر سائنس نے ثابت کیا ہے کہ زمین بلکہ اور فلکی اجرام بھی
ہر وقت اپنی گرمی نکال رہے ہیں جو انمیں واپس نہیں جاتی۔ سورج ہر آن ایک گرمی اور
روشنی نکال رہا ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونو چکر کھا کر پھر اسمیں جاملتی ہیں۔ غرض بہت سی
باتیں ہیں جن سے چکر پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ میرے آئندہ بیان سے ظاہر ہوجائیگا
کہ روح جیسی لطیف چیز جب جسم سے خارج ہوجاتی ہے تو پھر اسمیں نہیں آتی۔ نباتات
کی طرف دیکھتے ہیں تو عجیب کیفیت نظر آتی ہے۔ یہ مسلم ہے کہ نباتات میں بھی ایک
روح ہے۔ کیونکہ وہ نشو ونما پاتے ہیں۔ اب بظاہر صورت میں ایک درخت میں ایک ہی
روح ہونی چاہئے۔ اور جب وہ روح اسمیں سے خارج ہو تبھی ایک دوسرا درخت پیدا
ہونا چاہئے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آم کا درخت ہے۔ ظاہر میں ایک ہی درخت کی
روح اُس میں ہے۔ مگر وہ روح اُسمیں قائم رہتی ہے۔ درخت ہر سال پھل لاتا ہے اور اِس
پھل سے ہزاروں درخت پیدا ہوجاتے ہیں۔ پس یہاں تناسخ قائم نہیں رہا۔ بلکہ جب اُس
درخت کی روح خارج ہوجاتی ہے۔ وہ مرجاتا ہے۔ سوکھ جاتا ہے۔ پھر کوئی اور درخت کی
روح اُس کی طرف نہیں آتی۔ اور وہ ظاہر نہیں ہوتا۔ عین یہی حال انسان اور دیگر حیوانات کا ہے
اور پھر جب یہ اصول مانا جائے کہ ہر چیز چکر میں ہے۔ تو نیک اور بد افعال کی جزا اور
سزا اُٹھ جاتی ہے۔ اور مکتی ایک توہم رہ جاتا ہے۔ کیونکہ جب یہ مانا جائے کہ تناسخ ایک

دائمی چکّر کے قانون سے پیدا ہوتا ہے۔ تو فرضاً ہم نیک کام کریں بھی تو بے سود ہے۔
کیونکہ چکّر کا قانون پھر ہمیں کس قالب میں لے آئیگا۔ ضرور لائے گا اگر نہ لائے تو چکّر ٹوٹتا ہے
اور مسئلہ تناسخ باطل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم پوچھتے ہیں کہ جب چکّر ہی ہے تو یہ چکّر تو کبھی
بند نہیں ہوسکتا۔ پس مکتی کس چیز کا نام ہے۔ اور نیک و بد افعال کی تمیز ہی کیا رہی۔ غرض تناسخ
کو مانکر بہت سے تناقص پیدا ہوتے ہیں۔ جو عند العقل محال ہیں۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہماری انسانی زندگی تکلف یا راحت کی کسی گزشتہ
کرم کا نتیجہ ہے۔ تو وہ کرم کس جنم میں ہوئے۔ آیا کسی حیوانی جنم میں یا انسانی جنم میں۔ اگر حیوانی
میں کہا جائے تو صاف غلط ہے۔ کیونکہ یہ مسلم ہے کہ حیوانوں میں وہ ادراک Reason
اور اخلاق moralsense نہیں پائے جاتے۔ جس سے وہ نیک و بد میں تمیز کر سکیں
وہ اپنی حالت میں کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتے اور نہ تنزل ہی۔ ان میں صرف ایک حیوانی
عقل instinct پائی جاتی ہے۔ جو انکی حالت کے مطابق ہے اور وہ انہیں شروع
زندگی سے اخیر تک ایک حالت پر رہتی ہے۔ اور وہ اسمیں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔
ہاں بعض جانور ایسے ہیں کہ وہ سمجھانے سے سمجھ جاتے ہیں او بظاہر انیک و بد میں تمیز بھی کرتے
نظر آتے ہیں۔ مگر وہ سمجھنا ان کا کسی فہم Reason یا حس خلق moralsense
کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ سمجھانے سے وہ سمجھ جاتے ہیں تو وہ سمجھ انکی ایک عادت ہو جاتی ہے۔
اور وہ بھی ایک instinct ہی ہے۔ پس جب یہ ظاہر ہے کہ ان کے افعال مجبوری
ہیں۔ تو یہ ہرگز معقول اور جایز نہیں کہ کوئی جزا و سزا کا نتیجہ انکے افعال پر مترتب کیا جائے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ ہماری زندگی کی حالت کسی پہلی انسانی زندگی کے افعال پر مبنی ہے
تو یہ بھی درست نہیں۔ بدیں وجہ کہ اس پر دو اعتراض لازم آتے ہیں۔ اول یہ کہ جب انسان

مرجاتا ہے یعنے ایک جون بھگت چکتا ہے - تو دوسرا جنم اسکا سزا ہی جنم ہونا چاہئے - یعنے اسکو کوئی حیوان کتا - گدھا وغیرہ بننا چاہئے - کیونکہ اس اعتقاد کے اراوے سے یہ ظاہر ہے کہ جب ایک انسانی زندگی ختم ہوجاتی ہے - تو نتیجہ اُس زندگی کے کرموں کا بعد ہی کی زندگی میں ملنا چاہئے - دوسرا یہ اگر ایک انسانی زندگی کے بعد ہی دوسری انسانی زندگی شروع ہوجاتی ہے - تو اسکا کیا سبب ہے - یہ تو ایک طرح کا ظلم ہے کہ اسکو پہلی زندگی کی بدافعالیوں پر دوسری زندگی کی بدافعالیاں زائد ہوں گی - اور اس طرح اُسکو کسی اور غرائی جنم میں دوہرا عذاب اُٹھانا پڑے گا - اگر یہ کہا جائے کہ وہ دوسری انسانی زندگی میں نیک کام کرنے کا موقع پاتا ہے - جس سے اسکی عذابی حالت میں تخفیف ہوسکتی ہے - تو اسپر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں انسان کو بار بار انسانی صورت میں لایا جائے - تاکہ اُس کو پہلی بدکرداریوں کی اصلاح کا موقع ملے - مگر اس صورت میں بھی ایک دقت پیش آتی ہے - وہ یہ کہ جب انسان کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کن اعمال کی سزا بھوگ رہا ہے اور اصلاح کس بات میں کرنی ہے - تو ہرگز لازم نہیں آتا کہ وہ ضرور ترقی ہی کریگا - ممکن ہے کہ وہ بجائے ترقی اور اصلاح کے تنزل کی حالت میں گرا رہے - اور اِس صورت میں بار بار کی پیدائش کی غرض باطل ہوجاتی ہے - اور جب غرض باطل ہوئی تو مسئلہ ساتھ ہی جاتا رہا -

اس کے علاوہ ہمارا سوال ہے کہ جب انسانی زندگی کی غرض تناسخ کے ذریعہ کمال تک پہنچتا ہے - تو اس کمال کے نشان کیا ہیں - کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اُس کمال یا بدیگر الفاظ مکتی کے نشانات کیا ہیں - تو ہمارا ایک دھمی مکتی کے پیچھے پڑنا اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنا ہے - جب تک اُس نجاتی حالت کے نشانات معلوم نہ ہوں ہمیں پتہ نہیں سکتا کہ ہم مکتی کی طرف جارہے ہیں یا دوسری طرف - اور نہ ہی ہمیں کوئی تسلی اور

اطمینان ہوسکتا ہے۔

اور پھر یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو یہ مانا جاتا ہے کہ ہر انسانی زندگی گزشتہ زندگی کے اعمال کا پھل ہے۔ اور دوسری طرف یہ گمان ہے کہ وہ ہر زندگی میں ترقی بھی کرسکتا ہے اور تنزل بھی۔ چاہئے تو یہ کہ اگر اُسکی زندگی سزای حالت ہے، تو اسمیں اصلاح ہی اصلاح ہو۔ اور دوسری زندگی virginbirth معصومیت کی حالت سے شروع ہو۔ مگر آریہ عقیدہ کے مطابق یہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک جب انسان virginbirth کے لائق ہوجاتا ہے۔ وہ مکتی یافتہ کہلاتا ہے۔ اور اگر وہ ترقی بھی کرسکتا ہے اور تنزل بھی۔ تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی تقدیر میں فعل مختار ہے۔ اور جب فعل مختار ٹھیرا تو ساتھ ہی یہ ماننا پڑا کہ وہ کسی گزشتہ حیات کے عملوں کا نتیجہ نہیں بھوگ رہا۔ بلکہ یہی ایک زندگی virginbirth معصومیت سے شروع ہوئی اور اسی میں وہ ایمان اور عمل میں مکتی پاسکتا ہے۔ اگر وہ گناہ کی آلودگیوں کے ساتھ مرا ہے۔ تو وہ آلودگیاں اُسکی اور طریقہ سے دھودی جائیں گی جسکو ہم مسلمان جہنم سے تعبیر کرتے ہیں۔ غرض یہ خیال کہ انسان اپنی زیست میں گزشتہ افعال کی سزا بھگت رہا ہے۔ مگر وہ ہر زیست میں اصلاح پذیر بھی ہے اور تنزل پذیر بھی۔ ایک تناقص Contradiction ہے جو تناسخ کے ماننے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہے۔

اسی کے ضمن میں ایک یہ سوال بھی ہے کہ جب انسان کو انسانی زندگی ایک سزای حیوانی زندگی کے بعد ملتی ہے۔ تو وہ شروع کہاں سے ہوتی ہے۔ بہرحال وہ ایک معصومیت کی حالت سے شروع ہونی چاہئے۔ پس ہمیں بتایا جائے کہ وہ معصومیت کی حالت

کون سی ہے۔ اور کیا وہ آریہ قوم میں ہے یا دوسری قوموں میں۔ اگر وہ آریہ قوم میں ہے
اِس وجہ سے کہ ان کے خیال کے مطابق آریہ مذہب ہی سچا ہے۔ تو ظاہرا اور بدیہہ صورت
میں یہ ناممکن ہے۔ آریہ قوم کی تعداد قلیل ہے۔ دنیا میں لاکھوں جانور مرتے ہیں اور مارے
جاتے ہیں۔ اِس قلیل تعداد میں وہ سب کے سب آریہ قوم میں جنم نہیں لے سکتے۔ اگر یہ
کہا جائے کہ دوسری قوموں میں بھی ابتدائی حالت انسان کی شروع ہوتی ہے۔ تو پھر عقیدہ
تناسخ اس طرح ٹوٹ جاتا ہے کہ آپ کے نزدیک تو اور سب قومیں غلطی پر ہیں اور آپ کے
اعتقادات کے مخالف جو ائیں افعال ہیں وہ سب گناہ ہیں مثلاً گوشت کھانا۔ طلاق دینا۔
ضرورت کے وقت نیوگ نہ کرانا وغیرہ وغیرہ تو پھر انہیں معصومیت کی حالت کیوں کر شروع
ہوسکتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ پیدا تو معصوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کے والدین۔ خویش و
اقارب اور دیگر قومی صحبت سے موثر ہو کر گناہگار ٹھہرتے ہیں۔ تو اس صورت میں اِن کا
بدفعل گناہ کیوں گنا جائیگا کیونکہ وہ رکھے ہی اُسی قوم میں گئے ہیں۔

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نیک و بد افعال کی تشریح کردی جائے۔ پس واضح
ہو کہ افعال اعتقادات پر منحصر ہیں۔ یعنے جس قسم کا انسان کا اعتقاد اور ایمان ہوتا ہے۔
ویسے ہی اس کے اعمال ہوتے ہیں۔ اعمال کیا ہیں Expression of thought
یعنے خیالات کا اظہار ہے۔ وہ Expression یعنے اظہار خیالات ہی کے مطابق
ہوتے ہیں۔ پس اگر ایک عمل جو انسان کے اپنے یا دوسرے کے اعتقاد۔ ایمان اور
خیال کے مخالف ہو تو وہ گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اس صورت میں گویا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو افعال
ایک مذہب میں دوسرے مذہب کے ایمان کے مخالف ہیں۔ وہ گناہ ہیں۔ اور اُس مذہب
کی روسے بنتیجہ ان افعال کا ہرگز نیک پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ اِس بنا پر میں نے یہ سوال

کیا ہے کہ ایک سزا کی زندگی کے بعد انسانی زندگی کس طرح شروع ہوتی ہے۔ اور دکھایا ہے کہ خواہ کسی طور پر اِس کا جواب دیا جائے تناسخ غلط ثابت ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض موسموں میں خاص قسم کے جانور لکھوکھا پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کا عقیدہ صحیح ہے کہ انسان مر کر اپنی بد افعالیوں کے باعث حیوانات کا جسم لیتا ہے۔ تو اس صورت میں یہ ہونا چاہئیے کہ اُن خاص موسموں میں گناہ بنی نوع انسان میں خاص قسم کے اور بہت زیادہ ہونے لگ جاتے ہیں۔ پس جو اس موسم میں مرتا ہے وہ انہی حیوانات کا جسم دیا جاتا ہے۔ مثلاً ہر کوئی جانتا ہے کہ موسم برسات میں مینڈک مچھلی اور اسی قسم کے اور کیڑے بہت سارے دفعۃً پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اِس موسم میں خاص قسم کے گناہ بہت ہونے لگ جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ تناسخ ایک وہم ہے۔

یہ ثابت ہوا ہے کہ کسی گزشتہ زمانے میں بعض حیوانات* پائے جاتے تھے جن کا اب روے زمین پر وجود نہیں۔ تو کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ افعال جن کے باعث وہ حیوانی جسم دیا جاتا تھا۔ اب مفقود ہو گئے ہیں۔ تجربۃً اور تاریخ سے تو یہ ثابت نہیں۔ کہ کوئی ایسا گناہ جو پہلے سرزد ہوتا تھا۔ اب نہیں پایا جاتا۔ بلکہ برخلاف اِس کے ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کے زمانہ میں جو عین آزادی کا زمانہ ہے اور جسمیں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو خدا تعالےٰ کی ہستی کا منکر ہے۔ طرح طرح کے بدکام پائے جاتے ہیں۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئیے کیونکہ مثلاً جو انسان خدا کو بھی نہیں مانتا۔ اُسکو کسی فعل کے کرنے میں کوئی شرم و

*Plesios-aurus, Ichthyasaurus, mammoth, glyptodon: etc see "Wonders of the world" by uncle John, and "wonders unders the earth" by Jane besemeres.

حیا مانع نہیں ہو سکتے - اور کسی آیندہ زندگی کا خوف اُسے روک نہیں سکتا - پس اس سے بھی ثابت ہوا کہ مسئلہ تناسخ کی بنیاد نافہمی پر ہے -

اگر یہ مانا جائے کہ دنیوی راحت کے سامان یعنے مال و دولت - جاہ و حشم عقل و فہم گزشتہ نیک اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں - تو آج کل یہ سب بہبودی کے سامان مغربی قوموں میں پائے جاتے ہیں - تو کیا وہ سب قومیں پہلے نیک کام کر چکی ہیں - اگر وہ نیک کام کر چکی ہیں - تو کس طرح واضح ہو کہ ہر انسان کے افعال اپنے مذہبی عقائد کے ماتحت ہوتے ہیں - مگر آپ کے خیال کے مطابق سوائے آریہ مذہب کے سب عقائد باطل ہیں - تو گویا ان عقائد کے متعلق جو کرم کئے جائیں گے - وہ سب گناہ ہوں گے - پس سوائے آریہ صاحبان کے جو مریں گے - وہ سخت گناہ کی حالت میں مریں گے اور انکو دوسری زندگی میں دنیوی راحت نہیں مل سکتی - لہذا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ وہ مر کر اُن قوموں میں داخل نہیں ہو سکتے جو بہبودی کی حالت میں ہیں - کیونکہ وہ گناہگار ہیں اور انکو مادی راحت نصیب نہیں ہو سکتی اور دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ آریہ صاحبان جتنے مرتے ہیں - وہ دوسرا جنم انہی قوموں میں لیتے ہیں مگر یہ بدیہی غلط ہے کیونکہ آریہ قوم سے اُن اقوام کی تعداد بہت زیادہ ہے - اور تھوڑی تعداد بہتوں میں منتشر نہیں ہو سکتی - کیونکہ روح ایک عنصر ہے اور اس کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے جو یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایک روح ریزہ ریزہ ہو کر بہتوں میں پھیل جاتی ہے -

علاوہ ازیں اگر یہ اصول قائم کیا جائے کہ دنیوی جاہ و حشم اور مال و دولت نیک اعمال سے ملتے ہیں - تو امیر قوموں کا تو خاتمہ ہو جانا چاہیے تھا - کیونکہ ان میں آزادی زیادہ ہے اور دہریت پھیلی ہوئی ہے جس کے باعث گناہ بہت ہوتا ہے - مثلاً یہ مسلم اور ایسی بدیہی بات ہے کہ اسمیں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ شراب اور زنا اکثر گناہوں کی جڑ ہے - اور یہ دونوں اُن

ملکوں میں کثرت سے ہوتا ہے کہ الاماں۔ پس آپ کے خیال کے بموجب چاہئے کہ جو نہیں مرے پھر اُس قوم میں پیدا نہ ہو۔ پس ایک طرف سے تو یوں کمی ہوتی رہی اور دوسری طرف سے جیسا کہ میں بیان کر آیا ہوں۔ آریہ قوم مرکر انکو کافی تعداد بہم نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ جتنی اُن قوموں میں پیدائشیں ہوتی ہیں۔ اُنکا عشر عشیر بھی آریہ قوم کی تعداد نہیں۔ پس دونو طرف سے ایسی کمی وقوع میں آنی چاہئے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ تناسخ باطل ہے۔

اگر یہ مانا جاوے کہ روح کا مختلف جسموں میں جنم لینا اس کے اپنے ہی افعال کا نتیجہ ہے۔ تو یہ کیا غضب ہے کہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔ یا یاد نہیں رہتا کہ وہ کن افعال کی سزا ہے۔ کیا یہ ظلم نہیں کہ سزا تو دی جاوے۔ مگر یہ نہ بتایا جائے کہ کس کرم کی سزا ہے۔ جبتک بتایا نہ جائے اور جرم قائم کرکے سزا نہ دیجاوے۔ تو اصلاح کی کیونکر امید ہو سکتی ہے۔ ایسے خدا کی خدائی سے تو ہمارے انسانوں کی گورنمنٹ اچھی ہے۔ دیکھئے عدالتوں میں جب تک جرم ثابت نہ ہو۔ سزا نہیں دیجاتی اور پھر سزا دینے وقت بتایا جاتا ہے کہ فلاں جرم کی سزا ہے۔ اور عند العقل یہی طریقہ انصاف بھی ہے۔ یہ تو لغو معلوم ہوتا ہے کہ سزا دیجائے۔ مگر یہ جتایا نہ جائے کہ وہ کس گناہ کی سزا ہے۔ اور پھر طرفہ یہ کہ بار بار اُسے انسانی جسم میں بھیجا جائے کہ وہ اصلاح کرے۔

اگر یہ کہا جائے کہ پہلے جنم کی واقفیت اور علم نہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ روح بذاتہٖ feel یا think نہیں کر سکتی۔ یعنے بطور خود کوئی دُکھ اور سُکھ محسوس نہیں کر سکتی۔ جب ایک جسم چھوڑ کر دوسرے میں جاتی ہے تو اس عرصہ میں سب باتیں بھول جاتی ہے۔ تو اس پر ہمارا یہ سوال ہوگا کہ جب وہ علم اور ارادہ نہیں رکھتی۔ تو اس نے وہ کام کس طرح کیے۔ جن کے باعث اُسے مختلف اجسام میں جانا پڑا۔ اور پھر اگر مادی جسم کا ہونا روح کے ساتھ

کسی فعل کے کرنے کے لئے ضروری ہے۔ تو پھر صرف روح کو ان کاموں کے کرنیوالی کیوں قرار دیا جاتا ہے۔ اور انکے باعث اُسکو مختلف اجسام کیوں دئے جاتے ہیں۔

اگر آپ یہ کہیں کہ پہلے جنم کا علم یوگ کی مشق سے ہو سکتا ہے۔ تو یہ فضول ہے۔ کیونکہ سوال تو یہ ہے کہ جب سب سزا بھوگ رہے ہیں۔ تو انکو ان گناہوں کا کیوں علم نہیں دیا گیا تا وہ اصلاح کرتے۔ اور پھر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ آپ میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو پہلے جنم کا علم رکھتے ہیں۔ مگر واضح رہے کہ گزشتہ قصے کہانیاں عبث ہیں۔

بعض صاحباں کہتے ہیں کہ بچے کا رونا اور انسان کا موت کے وقت گھبرانا اس بات کی شہادت ہے، کہ اُس نے اِس سے پہلے بھی ضرور پیدائش اور موت کا مزہ چکھا ہے۔ مگر یہ عجیب منطق ہے کہ بچہ اُس حالت میں کہ اُسے کوئی فہم اور ادراک نہیں ہوتا۔ گزشتہ جنم کا خبردار ہوتا ہے۔ مگر جوں جوں ہوش سنبھالتا ہے۔ سب باتیں فراموش کرتا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ من گھڑت دلیل ہے کہ انسان موت کے وقت اسواسطے گھبراتا ہے اور خوف کرتا ہے کہ اُس نے پہلے موت دیکھی ہوئی ہے۔ یا اُسے خوف ہوتا ہے کہ اب کسی حیوان کے جسم میں جانا پڑے گا۔ ہر انسان ہوش میں ہوتے ہوئے جانتا ہے کہ وہ موت سے اسواسطے گھبراتا ہے کہ اُسے آئندہ زندگی کا پتہ نہیں ہوتا۔ اور اس زندگی کے تعلقات اور مزے جو وہ دیکھ چکا ہے۔ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اور موت کے وقت جو تکلیف ہوتی ہے۔ اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے بھی اُس پر موتیں وارد ہو چکی ہیں۔ اور پھر بچہ کا پیدا ہوتے ہی رونا کوئی دلیل نہیں کہ اس نے پہلے بھی جنم لئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ بعض جانور ایسے ہیں کہ اُن کے بچے پیدا ہوتے ہی نہیں روتے۔ تو کیا اُنہوں نے پہلے جنم نہیں لیا ہوتا۔ اور پھر آپ جانتے ہیں کہ بچہ جو پیدا ہوتا ہے تو شکم مادر میں بھی اُس میں جان

ہوتی ہے۔ مگر اُس میں آواز پیدا نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اُس کے ہونٹوں کی ضرب سے ہوا میں جو آواز پیدا ہونے کا ذریعہ ہے Vibration پیدا نہیں ہوسکتی۔ علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر بھی تو روتا ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ بڑے ہو کر رونے کا موجب کچھ اور ہوتا ہے۔ مگر بچے کے رونے کا سبب یہی ہوتا ہے کہ اُس نے پہلے بھی جنم لئے ہوتے ہیں۔ جو سیدھی بات ہے وہ کیوں نہ مانی جائے کہ وہ اسواسطے روتا ہے کہ اُسے کوئی جسمانی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ زیادہ خوشی سے بھی رونا آجاتا ہے۔ اور وہ لوگ جن میں آپس میں محبت بہت ہوتی ہے۔ جب کبھی دیر کے بعد ملتے ہیں۔ تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں دنیا میں بہت سے بندگانِ خدا ہوئے ہیں اور ہیں۔ جو ایمان باللہ سے مطمئن ہو چکے ہیں اُنہیں موت کا خیال ہرگز لرزہ نہیں دیتا۔

غرض اگر دوسرے جسم میں جانا سزا ہے تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے۔ جب تک ہم محسوس نہ کریں کہ وہ سزا ہے۔ تو وہ کوئی سزا نہیں۔ ظاہرا مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانات اس سزا کو محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ وہ جس حالت میں ہیں۔ اگر اُسی حالت میں آزاد نہ رہیں تو بُرے خوش معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً گدھا گندگی کے ڈھیر پر چرنے سے خوش ہوتا ہے۔ گو ہمیں ظاہرا معلوم ہو کہ یہ زندگی کی ردی حالت ہے۔ مگر جب وہ اُسے محسوس نہیں کرتا تو وہ اُس کے لئے سزا نہیں ہوسکتی۔ اس پہلو سے بھی مسئلہ تناسخ غلط ثابت ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی آبادی بڑھتی جاتی ہے۔ مردم شماری کی رپوٹوں سے ظاہر ہے اور علاوہ اس کے ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ یہ روحیں کہاں سے آتی جاتی ہیں۔ کیا وہ کسی جگہ جمع ہیں۔ اور پہلے وہ معطل اور معلق رہیں۔ مگر اب وہ ادوماده سے

اتصال پکڑتی جاتی ہیں - یا کہیں پُرانے وقتوں کے مرے ہوئے حیوانوں اور انسانوں کی روحیں ہیں - جو مدت تک معطل رہیں - مگر اب کسی موافق ہوا کے چلنے سے مادہ کو قبول کرتی جاتی ہیں - وہم ہی وہم ہے - اِس مسئلہ تناسخ کا اصل کچھ نہیں -

انسان اور حیوان میں فرق ہے - اور وہ فرق صرف درجہ کا نہیں - بلکہ قسم کا فرق ہے انسان فہم اور ادراک والی ہستی ہے اور حیوان نہیں - اگر دونوں کی روح ایک جیسی ہے تو کیا وجہ ہے کہ حیوان کسی نوع کی ترقی نہیں کر سکتے - صاف ظاہر ہے کہ انسان اور حیوان کی روح میں فرق ہے - کیونکہ ایک کی روح دوسرے جسم میں جا کر کوئی ذاتی جوہر نہیں دکھا سکتی تناسخ کو مانکر انسان کو جو جامع صفات کائنات اور اخلاق حسنہ میں ترقی کر کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ سکتا ہے - حیوان کا پایہ دینا پڑتا ہے - ایسے عقیدے سے پروا ہے اور عقل سلیم رکھنے والا انسان اسکو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا -

تناسخ کو مانکر فضل ربانی کو خیرباد کہنا پڑتا ہے - اگر انسان کی راحت اور غم اس کے اپنے ہی افعال پر منحصر ہے - تو خدا کی کوئی ضرورت نہیں - اور نہ ہی اُسکی رہنمائی اور مدد کی - اگر انسان اپنے ہی کرموں سے نجات حاصل کر سکتا ہے - تو ہمارے خدا کی کیا ضرورت ہے کیا خدا کی صرف اسواسطے ضرورت ہے - کہ وہ روح کے افعال کے سبب اُسکو دوسرے جسموں کے ساتھ ملاتا رہے - اور بس - نہیں بلکہ ہمیں ضرورت ہے کہ وہ ہماری رہنمائی اور دستگیری کرے اور اگر سہواً کوئی غلطی ہو جائے تو اُسے معاف کرے - یہی انصاف کا تقاضا ہے - انسان ناقص ہستی ہے - اُسکی سب طاقتیں ناقص ہیں - اسواسطے عین ممکن بھی ہے کہ اُس سے سہو ہو جائے اگر اس سہو پر وہی نتیجہ مترتب کیا جائے جو ایک فعل کے دانستہ کرنے سے ہوتا ہے - تو یہ انصاف نہیں - اتنی رعایت تو ہم انسانوں میں

بھی پائی جاتی ہے کہ سہواً غلطی کا خیال کرتے ہیں بلکہ ہماری محسن گورنمنٹ جو عدل کا کامل نمونہ ہے۔ اس نے تو یہاں تک رعایت رکھی ہے۔ کہ فرضاً اگر کوئی خون بھی لاعلمی سے ہو جائے۔ تو اُسے معاف کر دیتے ہیں۔ ہمارے پریزیڈنٹ صاحب وکیل ہیں۔ انہیں ایسے قوانین کی بخوبی واقفیت ہوگی۔ وہ میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ غرض ایسے معاملات میں عدل ہاتھ سے نہیں جاتا اور جسے معاف کیا جائے اسپر رحم ہوتا ہے۔ مگر یہ قادر مطلق ہستی اچھی ہے کہ اُس میں عفو کی صفت مفقود ہے۔ حالانکہ یہ صاف ہے کہ اُس میں سب نیک صفات پائے جانے چاہئیں۔ اور حق تو یہ ہے کہ ہیں۔

جب یہ مانا جاتا ہے کہ ہماری زندگی گزشتہ افعال کا نتیجہ ہے۔ تو گویا ہم ایک محدود دائرے میں گھرے ہوئے ہیں اور اُس سے باہر نہیں جا سکتے پھر ہم میں یہ خواہش کیوں ہے کہ ہم ترقی کریں۔ اپنے لئے راحت کے سامان پیدا کریں اور غم و الم سے دور رہیں اور ان سے بچنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ جو ہم نے کرم کئے ہوئے ہیں اُسکا بدلہ تو ضرور ملنا ہی ہے۔ اصل میں اس خواہش کا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ہم راحت حاصل کر سکتے ہیں اور رنج سے بچ سکتے ہیں۔ پس مسئلہ تناسخ جاتا رہا۔

لاکھوں مخلوقات عالم میں انسان ایک حصہ ہے۔ اوّل تو یہ ہم کہہ نہیں سکتے کہ کسی گزشتہ زمانے میں انسانوں کا حصہ حیوانات میں زیادہ تھا۔ بلکہ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی آبادی ہمیشہ بڑھتی رہتی ہے۔ اور پھر یہ ماننا پڑتا ہے کہ حیوانات کے ہونے کے لئے ضروری ہے کہ انسان رہیں۔ انسان مریں تو حیوانات پیدا ہوں ورنہ وہ کہاں سے آئیں۔ مگر یہ خیال غلط معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر اس تناسخ کو ماننے کہ انسان برے کرم کر کے حیوان ہو جاتا ہے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ کوئی وقت البساضرور تھا کہ ذی روح مخلوقات میں انسان ہی انسان

تھا اور حیوانات بالکل نہیں تھے۔ مگر یہ غلط ہے۔ ہمارے آریہ صاحبان سائنس کے
بڑے شائق ہیں۔ لہذا انہیں دیکھنا چاہیے کہ سائینس کی رو سے یہ مسئلہ ثابت ہے یا
نہیں پس واضح ہو کہ سائنس نے یہ تحقیق کیا ہے کہ دنیا بتدریج ترقی کر کے اس حالت تک
پہنچی ہے Law of gradual progression یعنے پہلے یہ
ایک لطیف آتشی مادہ تھا۔ جوں جوں حرارت نکلتی گئی یہ مادہ منجمد ہوتا گیا۔ اس کے بعد نباتات
اور حیوانات پیدا ہوئے اور سب سے بعد انسان ظاہر ہوا۔ اس تحقیقات سائینس سے مسئلہ
تناسخ باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ آپ انسان کا وجود پہلے مانتے ہیں اور پھر حیوانات کا۔ مگر سائنس
یہ بتاتی ہے کہ پہلے حیوانات تھے۔ انسان بعد میں ظہور پذیر ہوا۔ بلکہ یہ مسئلہ سائینس مسلمانوں
کے خیالات کے کسی قدر مطابق ہے۔ کیوں کہ ہم مانتے ہیں کہ جب خداوند تعالیٰ نے
انسان کو پیدا کیا۔ تو پہلے اُس نے اُسکی آسائش کے سامان مہیا کر دئے تھے۔ پس ثابت
ہوا کہ سائنس کی رو سے بھی تناسخ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔

تناسخ کے ماننے سے ایک اور نقص لازم آتا ہے۔ وہ یہ کہ چونکہ آپکو معلوم نہیں ہوتا
کہ روح ایک جسم کو چھوڑ کر پھر کس جسم میں داخل ہوئی ہے۔ اس لئے ممکن ہے۔ بلکہ ضرور
ہونا چاہیے۔ کہ ایک وقت میں جو ماں اور بہن تھی۔ دوسرے وقت میں بیوی بنے۔ نعوذ
باللہ من ذلک۔ ہمیں تو ایسا مسئلہ بیان کرنے سے بھی شرم معلوم ہوتی ہے اور طبیعت رُکتی
ہے۔ اگر تناسخ صحیح ہوتا تو چاہیے تھا کہ آپ کو اتنا معلوم ہو جاتا کہ فلاں جسم میں والدہ وغیرہ کی
روح ہے۔ تاکہ آپ اس سے تعلق زوجیت پیدا نہ کرتے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے
معاف فرمائیں گے جو مجھے ایسے فقرے زبان پر لانے پڑے۔ مگر کیا کروں یہ ایک اعتراض
ہے جو مجھے سوجھا اور مجبوراً بیان کرنا پڑا افسوس ہے کہ تناسخ کا مسئلہ ماننے سے کیا کیا لغویات

کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یا اگر آپکی کتاب آسمانی میں بتلایا گیا ہے کہ اس مکروہ اتفاق کا پرمیشر نے کوئی انتظام کیا ہوا ہے۔ تو اسکو بیان کیا جائے۔ اسی پوئنٹ کے متعلق مجھے اور بہت سی باتیں سوجھتی ہیں۔ مگر وہ ایسی مکروہ ہیں کہ مجھے ان کے بیان کرنے سے شرم معلوم ہوتی ہے۔ لہذا میں ان کے بیان کرنے سے باز رہتا ہوں۔ البتہ اگر ضرورت ہوئی۔ تو پھر ظاہر کر دی جائیں گی اور پبلک کو معلوم ہو جائے گا کہ مسئلہ تناسخ کو ہرگز عقل انسانی قبول نہیں کر سکتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں ایران میں بھی یہ مسئلہ مانا جاتا تھا۔ مگر انہوں نے اس مسئلہ کی عملی حالت کو بہت دور تک پہنچا دیا تھا۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے وہاں اپنی ہمشیرہ وغیرہ سے نکاح جائز سمجھا جاتا تھا۔ غالباً وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب روح ایک جسم کو چھوڑ کر دوسرا جسم دھارتی ہے۔ تو یہ تو پتہ نہیں ہوتا کہ اب وہ کس جسم میں ہے۔ پس کچھ مضائقہ نہیں اگر ماں بہن سے بھی مباشرت کر لی جائے۔ مگر یہ دلیل لغو ہے محتاج تشریح نہیں اسلام نے جا کر اُنکو ان بدعملیوں سے نجات دی۔

یہ چند باتیں ہیں جو مسئلہ تناسخ کے متعلق میرے ذہن میں آئیں۔ اس کے جواب الجواب میں جو خیال میں آئیگا پھر بیان کر دیا جائیگا۔ غرض مختلف پہلوؤں پر نظر غائر ڈالنے سے بدیہی طور پر منکشف ہوتا ہے کہ تناسخ خیال باطل ہے۔ رہی یہ بات کہ تناسخ کو کیوں مانا جاتا ہے۔ سو آریہ صاحبان کے پاس سوائے اس کے اور کوئی جواب نہیں کہ بنی نوع انسان میں ایک فرق پایا جاتا ہے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی گزشتہ افعال کا نتیجہ ہے۔ اگر ایسا نہ مانا جائے تو پرمیشر ظالم ٹھیرتا ہے کہ کسی کو بلاوجہ تنگ دست رکھا ہوا ہے۔ اور کسی کے پاس لاکھوں روپیوں کے ڈھیر ہیں۔ یا کوئی صحیح العضو ہے اور کوئی

لنگڑا لنجا اور اندھا - انہوں نے اس تفرقہ کا غور سے مطالعہ نہیں کیا اور نہ اس تفرقہ کی حکمت کو سمجھے - بس آسانی سے کہہ دیا کہ گزشتہ جنم کوئی ضرور ہوگا جس کے کرموں کا یہ پھل ہے سو جناب! ذرا اور کائنات کی طرف خیال دوڑائیے - خالص مادہ - نباتات اور حیوانات میں سب میں یہ فرق عیاں ہے مٹی قسم قسم کی ہے اور اُس میں طرح طرح کے پتھر ہیں سونا چاندی لوہا اُسمیں ہے - ہیرے لعل جواہر اُسمیں ہیں - کیا یہ سب پہلے جنم کے افعال کا سبب ہے - نباتات میں ہزاروں قسمیں ہیں اور ان قسموں میں اختلاف پایا جاتا ہے کیا وہ بھی پہلے کسی دوسرے جنم میں تھے - جنکا پھل ان ہزار در ہزار قسموں کی دلیل سمجھا جائے حیوانات میں بے شمار قسمیں ہیں اور انمیں فرق ہے -

مادہ کی حالت سے شروع ہو کر مٹی ہے - اسمیں کوئی مٹی سرخ ہے - کوئی سفید سیاہ اور پیلی - پھر پتھر ہے اور اُسمیں ہزار قسم ہے - نباتات کا یہی حال ہے - مثلاً آم ہے - ہر ایک درخت دوسرے سے مختلف ہے اور انکا پھل بھی ذائقہ اور شکل میں ایک دوسرے سے نہیں ملتا - ایسا ہی حال اور درختوں کا ہے - پھر حیوانات کی طرف آتے ہیں تو یہی فرق پاتے ہیں - ہزار در ہزار نوع ہیں اور ہر ایک نوع کے افراد ایک دوسرے سے مختلف ہیں - عام حیوانوں کو دیکھئے - گھوڑے کی قسم ہے - ایک گھوڑا دوسرے سے بکلی مشابہ نہیں - ایک کُتا دوسرے سے مختلف ہے اور ایک بلی دوسرے سے علیحدہ اور پھر ان سب کی نشست برخاست میں فرق ہے - ایک کتا انگریزوں کے پاس ہے - اُس کی بڑی خاطر ہوتی ہے - نہلایا دھلایا جاتا ہے - اور کھانا عمدہ پیٹ بھر کے کھاتا ہے اور ایک کُتا عام گلی کوچوں میں پھر کر ایک ایک لقمہ کر کے زندگی بسر کرتا ہے -

غرض کُل کائنات⊗ میں فرق بین پایا جاتا ہے - پس اگر وہی فرق انسانوں میں پایا جائے تو دلیل تناسخ کیوں ٹھیرے - اور پھر غور کیجئے کہ اگر سب انسان ایک ہی حالت میں ہوتے تو دنیا کا کارخانہ کیسے چلتا - یعنے سب کے سب امیر اور متمول ہوتے اور عیش و آرام میں ہوتے تو ایک دوسرے کی کون سنتا - اُسوقت تو بالکل ایک confusion اور anarchy کی حالت پیدا ہو جاتی -

اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ راحت کا ہونا دولت دنیا پر منحصر نہیں - جتنا جسکو دیا جاتا ہے اُتنا ہی اُس سے لیا جاتا ہے - یعنے وہ اُتنے ہی کا ذمہ وار ہوتا ہے - ایک غریب سے بادشاہ کے مناسب حال مواخذہ نہیں ہو سکتا - اور دولتِ دنیا تو بسا اوقات ٹھوکر اور تکلیف کا باعث ہوتی ہے - اور فکر اور اندیشہ اُس سے پیدا ہوتے ہیں - اور بہت سی روحیں اُسی کی بدولت فسق و فجور میں پڑکر خسارہ اُٹھاتی ہیں - اور بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بادشاہ کو تخت پر وہ خوشی نصیب نہیں ہوتی - جو ایک غریب مزدور کو اپنی کُٹھیا میں حاصل ہوتی ہے - پس نتیجہ یہ نکلا کہ دولت کے ساتھ راحت کا ہونا لازمی نہیں - بلکہ اُس کے حاصل کرنے کے اور ہی ذریعے ہیں -

حقیقی راحت اور خوشی کا مال دنیا ہی ذریعہ نہیں ہے - بہت سے انسان اسی میں لذت محسوس کرتے ہیں کہ وہ مسکنت کی حالت میں رہیں - کیونکہ اُس میں یاد الٰہی خوب ہوتی ہے - بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو خدا سے تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں - وہ لوگ جو مکتی حاصل کرنا چاہتے ہیں - وہ دولت دنیا اور کسی مادی شَے سے دل نہیں لگاتے - اگر ان کے پاس دنیا کے عیش و عشرت سے سامان موجود بھی ہوں - تو وہ ان کی پرواہ نہیں کرتے

⊗ اجرام فلکی سورج چاند ستارے بھی اپنی ہیئت اور تاثیرات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۱۲

گو وہ بقدرِ ضرورت اِن سے فائدہ اُٹھائیں۔ اگر ان سے وہ سب سامان چھین لئے جائیں تو انہیں کوئی رنج اور قلق نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جنہیں نظر آجاتا ہے کہ خدا ایسی ہستی ہے کہ اُس سے پیوند ملانے سے حقیقی راحت ملتی ہے۔ وہ دنیا کو ہیچ سمجھتے ہیں اور اُس سے تعلق قطع کر لیتے ہیں۔ یعنے دنیا میں رہ کر ہی گو سب کاروبارِ دنیوی بجالاتے ہیں۔ مگر وہ کاروبار ان کا خدا تعالیٰ کی رضا کے ماتحت ہوتا ہے۔ اور انہیں ہرگز شاق نہیں گزرتا کہ ان سے دنیوی حشمت وجاہ چھین لیا جائے۔ گو اسمیں شک نہیں کہ جو لوگ اس طرح خدا کے ہو جاتے ہیں۔ خدا انہیں نامراد اور ناکام نہیں چھوڑتا۔ وہ ان کا ہو جاتا ہے اور ان کی سب مرادیں برلاتا ہے۔ اور فلاح کے مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ہمارا ظاہری تجربہ ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ مجرد دنیا کا مال و متاع حقیقی خوشی کا ذریعہ نہیں۔

اسی دلیل سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جن کو ہم مفلس اور غریب کہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اُس میں رنج اور تکلیف ہی ہو۔ جو شخص قانع ہے وہ جس حالت میں رکھا جاتا ہے خوش ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ زندگی بسر کرنے کے لئے بڑے سامانوں کی ضرورت نہیں سادہ کپڑے اور کھانے سے عمدہ گزارہ ہو سکتا ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ اس خیال سے کسی قسم کی ترقی نہ کیجائے۔ نہیں بلکہ جہاں تک ہو سکے معلومات بڑھانے چاہئیں اور خوشی کے سامان پیدا کرنے چاہئیں۔ میری غرض صرف یہ جتلانے کی ہے کہ دنیا کا جاہ و حشم ہی حقیقی خوشی کا موجب نہیں۔ حقیقی خوشی کا تعلق دل سے ہے۔ ایسے خیالات ہونے چاہئیں اور ایسے ذریعے پیدا کرنے چاہئیں جس سے تسکینِ قلب حاصل ہو۔ کیونکہ واقعہ میں اطمینانِ قلب کا نام ہی حقیقی راحت ہے۔ دنیوی مال و دولت

کی راحت حقیقی راحت نہیں۔ وہ عارضی اور جھوٹی راحت ہے۔ مال و دولت کی تبدیلی سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ پس راحت وہ حاصل کرنی چاہیے جو قائم رہے۔

بعض انسانوں میں جسمانی نقص ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ اندھے لنگڑے لولے ہوتے ہیں جو بادی النظر میں ایک مصیبت ہے۔ مگر ان کے مخالف انہیں اور نیکی کے پہلو عام انسانوں سے بڑھکر ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص آنکھوں سے نابینا ہے۔ مگر اُس کا فہم و ادراک عام لوگوں سے بدرجہا تیز ہوتا ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ ظاہراً صورت میں جسکو ہم سزا کی حالت میں سمجھتے ہیں وہ سزا نہیں۔ کیونکہ ایک نقص ایک نیکی Counterbalance ہوا ہوا ہے۔

پس ثابت ہوا کہ یہ تفرقہ انسانی دنیا میں عقل و فہم کا۔ مال و دولت کا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اِس بات کا نتیجہ نہیں کہ کسی گزشتہ جنم میں طرح طرح کے کرم کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ تو ظاہری انتظام دنیا ہے اور ایک حکمت پر مبنی ہے۔ کیونکہ جب یہ ثابت ہے کہ حقیقی خوشی حاصل کرنے کے لئے کوئی سوشل تفرقہ سدراہ نہیں ہو سکتا۔ تو یہ ہرگز قابل تسلیم نہیں کہ دنیوی مال و منال ہی باعثِ راحت ہے اور مفلسی لازمی طور پر عذاب ہے۔

پس نتیجہ یہ ہوا۔

(۱۰) یا ایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفسٍ واحدۃٍ وخلق منها زوجها وبث منهما رجالاً کثیراً ونساء۔ الخ

یعنے انسانی روح ایک ہی ہے جو جمادات اور نباتات اور دیگر حیوانات کی روح سے ممیز ہے۔ اور اُسی روح سے مرد و عورت اور ان سے ہر دو کی کثرت ہو رہی ہے۔

(۲) روح امرِ رب سے ہے یسئلونک عن الروح۔ قل الروح من امر ربی
روح باہر سے نہیں آتی۔ بلکہ انسانی نطفہ میں موجود ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جب تک
ایک مرنے دوسرا پیدا نہ ہو۔ بلکہ تحقیقات سے ثابت ہے کہ آبادی بڑھ رہی ہے یعنے موتوں
کے مقابلہ میں پیدائشیں زیادہ ہوتی ہیں۔

(۳) لقد خلقکم اطوارا۔ اُسی نے یہ مختلف شکلیں بنائی ہیں۔ یہ
کسی گزشتہ افعال کا نتیجہ نہیں۔

(۴) فخلق کلّ شیءٍ فقدرہٗ تقدیرا۔ اُسی نے ہر ایک کو اُس کے
مناسب حال ایک اندازہ پر رکھا ہوا ہے۔ اور اُسی کے مناسب حال اُس سے
پرسش ہوگی۔

اب میں مضمون۔

روح اور مادّہ کی ازلیت

کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ سو واضح ہو کہ روح اور مادہ مخلوق ہیں۔ قائم بالذات نہیں۔
اِس عقیدہ کے ثبوت میں چھ منطقی دلیلیں قرآن شریف سے پیش کی گئی تھیں جنکی
تاحال تردید نہیں ہوئی۔ انکو نظر انداز کرکے صرف دو باتیں پیش کی گئی ہیں۔ جن سے یہ
ثابت کرنیکی کوشش کی گئی کہ ہر دو ازلی ابدی ہیں۔ اوّل۔ تناسخ اور دوم یہ اصول کہ صرف
عدم سے کوئی چیز مجسم پیدا نہیں ہوسکتی۔ مگر یہ دونو باتیں فرضی ہیں۔ تناسخ کی بابت تو میں
بیان کرچکا ہوں کہ یہ مسئلہ باطل ہے۔ پس جب مسئلہ ہی غلط ہے تو روح اور مادہ کے
ابدی ہونے پر دلیل نہیں ٹھیر سکتا۔ دوسرا آپ نے سائنٹفک اصول پیش کیا ہے کہ نیست سے
ہست نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ بھی ایک سائنٹفک اصول ہے کہ کوئی چیز بغیر علت قائم
نہیں ہوسکتی۔ پس ہمیں بتایا جائے کہ روح اور مادّہ کا موجب کون ہے اور کس طرح ہے۔
آپ کہتے ہیں کہ Something (کوئی شے) Nothing (نیست) سے
پیدا نہیں ہوسکتی۔ معکوس طور پر گویا ایک چیز کسی چیز ہی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ اچھا فرض کرو
کہ روح اور مادہ کچھ چیز ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اگر یہ دونو نیست سے نہیں تو کس
چیز سے پیدا ہوئے ہیں۔

ہم ایمان رکھتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے انکو پیدا کیا ہے۔ البتہ ہم یہ نہیں بتا سکتے
کہ کس طرح۔ کیونکہ ہم ہمہ وجوہ ناقص ہیں۔ ہمیں علم تام حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہمارا وجود
محدود اور ہماری کل طاقتیں محدود ہیں۔ تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ ہمیں غیر محدود کا علم مل جائے۔

اگر ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ خدا تعالےٰ نے روح اور مادہ کو کس طرح پیدا کیا تو ہمارے مقابلہ
میں آریہ صاحبان بھی ہرگز نہیں بتا سکتے کہ محض اجزا سے اُس نے دنیا کا عجیب کارخانہ
کس طرح رچایا۔ آپ کے نزدیک قادر مطلق خدا کے واسطے روح اور مادہ کا پیدا
کرنا ناممکن ہے مگر محدود روح اور مادہ خود بخود ہست ہیں۔ اگر ایک قادر مطلق اور غیر محدود
ہستی کے واسطے ایک محدود چیز کا پیدا کرنا ناممکن ہے۔ تو ایک محدود چیز خود بخود کیونکر
قائم ہو سکتی ہے۔

بیشک ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اُس نے محض عدم سے دنیا کو کس طرح پیدا کیا۔ یہ
ایک بھید ہے۔ مگر ایسے ہی اور بہت سی باتیں ہیں جن کے سمجھنے میں ہماری عقل قاصر
ہے۔ مثلاً آپ کا عقیدہ ہے کہ پرمیشر نے روح اور مادہ سے یہ کارخانہ بنایا ہے۔ ہم پوچھتے
ہیں کہ خدا تو ایک spirit (روح) ہے۔ وہ بغیر مادی ہاتھوں کے مادہ کو کیونکر پکڑ سکتا
ہے۔ اُس نے بغیر ہاتھوں اور ہتھیاروں کے مختلف شکلیں کس طرح بنائیں۔ سوائے
اس کے آپ کیا کہہ سکتے ہیں کہ مادہ اور روح اُس کے زیر فرمان ہیں۔ وہ جس طرح
جسم دیتا ہے اُسی طرح یہ تغیر کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہاں پھر ایک راز ہے جو نہ آپ سمجھ سکتے
ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں۔ وہ تو صرف روح ہے۔ اُسکا مونہہ نہیں۔ لہذا حکم کس طرح
دیتا ہے۔ یہ عام عقیدہ ہے کہ خدا تعالےٰ ایک ایسی ہستی ہے جو عالم کل ہے اور ہر جگہ حاضر و ناظر
ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کیونکر ممکن ہے پس جب آپ دیگر صفات الٰہی کو نہیں
سمجھ سکتے۔ تو اُس کے قادر مطلق ہونیکی صفت پر کیوں احاطہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ مانا جاتا ہے کہ روح اور مادہ مخلوق نہیں بلکہ ازلی ابدی ہیں۔ مگر ایک تیسری ہستی کا
اِن دونوں پر تصرف ہے۔ اور وہ جس طرح چاہتا ہے انکو جوڑ میل کر کام لیتا ہے۔ اِس سے

بین نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ روح اور مادہ صاحب علم اور ارادہ نہیں۔ کیونکہ اگر ان میں علم اور ارادہ ہو تو تغیر اشکال میں غیر کے محتاج نہیں ہو سکتے۔ پس جب وہ علم اور ارادہ نہیں رکھتے تو قائم بالذات کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ یہ عند العقل محال ہے جو چیز علم اور ارادہ نہیں رکھتی۔ وہ اپنی آپ ہی خالق نہیں ہو سکتی۔ ثابت ہوا کہ روح اور مادّہ مخلوق ہیں۔

برخلاف اس کے اگر یہ مانا جائے کہ روح اور مادہ ازلی ابدی ہیں۔ تو یہ بھی ساتھ ہی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ علم اور ارادہ رکھتے ہیں۔ مگر واضح ہو کہ انکا علم اور ارادہ ہونا دو طرح پر باطل ثابت ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ جو چیز علم اور ارادہ رکھتی ہے۔ وہ اپنے افعال میں غیر کی محتاج نہیں ہو سکتی۔ اور یہ قانون قدرت کل کائنات میں ذی روح مخلوق میں پایا جاتا ہے۔ اسکی تشریح کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ روح اور مادّہ اپنے افعال میں غیر کے محتاج ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ وہ علم اور ارادہ نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ جو چیز علم اور ارادہ رکھتی ہے وہ اپنے لئے کوئی نقص روا نہیں رکھ سکتی۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ روح اور مادّہ نقص رکھتے ہیں۔ مثلاً ہم روح اور مادّہ سے مرکب ہیں۔ اگر ہم کوئی نقص اپنے آپ میں پائیں تو اُسکو دور نہیں کر سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری دو آنکھیں پیچھے بھی لگ جائیں تاکہ ہم ایک دفعہ ہی چاروں طرف دیکھ سکیں۔ یا ہمارے بہت سے ہاتھ ہو جائیں۔ تاکہ بہت سے کام ایک ہی وقت میں کر سکیں۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ بذاتہ وہ کچھ علم اور ارادہ نہیں رکھتے۔ اِس لئے وہ قائم بالذات نہیں ہو سکتے۔ علاوہ اِس کے یہ بات کہ وہ صاحب علم اور ارادہ نہیں۔ ایک اور طرح پر بھی بین طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جب روح اور مادّہ الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ یعنے جب انسان مرجاتا ہے۔ تو روح تو چونکہ ایک لطیف چیز ہے۔ ہمارے مشاہدہ میں نہیں آتی۔ مگر جسم کو ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ حرکت نہیں

کرسکتا - پس جب عقلی دلائل سے ثابت ہوگیا کہ روح اور مادہ محض وجود ہیں۔ لطیف یا کثیف - جنمیں ذاتی طور پر کوئی علم اور ارادہ نہیں - توکوئی عقل سلیم یہ نہیں مان سکتی کہ وہ قائم بالذات ہوں - قائم بالذات چیز میں یہ لازمی ہے کہ وہ ان دو نو صفات سے متصف ہو۔

آریہ صاحبان کا یہ عقیدہ ہے کہ گو ان میں بذات خود یہ صفات نہیں - مگر پرمیشر ان سے اپنے حکم سے کام لیتا ہے - مگر ہم پوچھتے ہیں کہ جس چیز میں کوئی ذاتی جوہر علم اور ارادہ کا ہے ہی نہیں - تو وہ اُسکا حکم آئندہ کیون کر مان سکتی ہے - آریہ صاحبان عقلی دلیلوں کے بڑے شائق ہیں - اِس لئے انہیں عقلی دلیلیں دی جاتی ہیں - اور پھر برخلاف اِس کے اگر وہ علم اور ارادہ کے مالک ہیں - تو ہم پوچھتے ہیں کہ اُن میں آپس میں اتصال قائم کرنے کے لئے تیسری ہستی کی ضرورت ہی کیا ہے وہ خود بخود مل سکتے ہیں - اور مختلف شکلیں پیدا کرسکتی ہیں - افسوس کہ ایسے خیال کی پیروی کرکے خدا تعالےٰ کی ہستی سے بھی انکار کرنا پڑتا ہے اور سچ تو یہی ہے کہ روح کو اور مادّہ کو ازلی ابدی ماننا ایک نوع کی دہریت ہے - پھر علاوہ اِس کے اگر وہ ذات باری کیطرح ازلی ابدی ہیں اور صاحب علم اور ارادہ ہیں تو اگر وہ حکم باری کی خلاف ورزی کریں یا اُسے نہ مانیں تو بتائے پرمیشر کیا کرسکتا ہے - ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا - وہ انکو فنا نہیں کرسکتا اور نہ انکو کوئی تکلیف پہنچا سکتا ہے -

شاید آپ اِس کا یہ جواب دیں کہ روح اور مادّہ میں یہ طاقت ہی نہیں کہ حکم عدولی کریں - بلکہ انکی ذاتی صفت ہے کہ مطیع ہوکر رہیں - مگر اِس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر اُن کی ذاتی صفت ہے، کہ خدا تعالےٰ کی فرماں برداری کریں - تو بایں صفت کہ وہ ازلی ابدی ہیں وہ تکلیف محسوس کیوں کرتے ہیں - کیونکہ جو جسکی ذاتی صفت ہوتی ہے وہ اُسمیں خوشی محسوس کرتا ہے نہ کہ رنج - مگر ہم اپنی ذات سے تجربہ رکھتے ہیں کہ تکلیف ضرور ہوتی ہے

پس ثابت ہوا کہ روح اور مادہ مخلوق ہیں۔

اور چونکہ روح اور مادہ فرداً فرداً کوئی عمل نہیں کر سکتے۔ اس لئے ثابت تو ہوا کہ وہ علم اور ارادہ نہیں رکھتے۔ مگر کیا آریہ صاحبان ہمیں بتا سکتے ہیں کہ جب وہ علیحدہ علیحدہ کوئی فعل نہیں کر سکتے۔ تو مل کر اُن میں کرم کرنے کی طاقت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ اور پھر اگر کوئی خیال باندھا بھی جائے کہ نہیں انمیں فرداً فرداً خاص خاص کاموں کی طاقت ہے اور وہ کرتے ہیں تو ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ان افعال کی بھی جزا و سزا ہوتی ہے اگر ہوتی ہے تو کس طرح۔ اور اگر نہیں تو کیا وجہ۔ کیا وجہ کہ ان دونو کے اتصال سے جو فعل سرزد ہوں ان پر تو ایک نتیجہ قائم ہو۔ اور اگر فرداً فرداً وہ کوئی کرم کریں تو اُس پر کوئی نتیجہ قائم نہ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ روح اور مادّہ کا ازلی ماننا ایک وہم ہے۔ حقیقت حال یہی ہے کہ کل کارخانے اور کل کاروبار اُسی کی ذات سے ہیں۔ وہ حیی و قیوم اور اپنی ذات میں آپ قائم ہے۔ اور اُسی کی ذات سے سب ظہور ہے۔ اگر وہ ذات نہ ہو (نعوذ باللہ) تو روح اور مادہ بھی نہ ہو۔

فطرتاً ہم ایک کشش محسوس کرتے ہیں جو خدا تعالےٰ کی محبت اور عشق میں ایک لذت حاصل کرتی ہے۔ یہ بھی ایک دلیل ہے اس بات پر کہ روح اور مادّہ مخلوق ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ازلی ہیں تو اول تو اُن پر جیسا میں بیان کر چکا ہوں غیر کا تصرف نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ہے تو اس وجہ سے کہ انکی آزادی میں فرق آیا اور تغیر و تبدل سے انہیں تکلیف پہنچی۔ ان کو اُس ہستی سے جو ان پر جبر کرتی ہے۔ ناراض ہونا چاہئیے تھا۔ مگر برخلاف اس کے ہم جانتے ہیں کہ اس اتحاد سے وہ ایک خوشی حاصل کرتے ہیں۔ پس ظاہر ہوا کہ وہ اُسی کے مخلوق ہیں۔ آپ کو صرف عقلی دلائل چاہئے۔ سو عقل کا اس بات پر تجربہ ہے کہ ہر شے جو علم و ارادہ رکھتی ہے۔ وہ آزادی کو پسند کرتی ہے اور جو ان پر زور بازو سے حکومت کرتا ہے۔ اس سے

طبعاً ناراض ہوتی ہے۔ کسی مطلب کے لئے خوشامد کرنا اور بات ہے۔ پس جب ظاہر ہے کہ
روح اور مادہ یاد الٰہی میں لذت اور سرور حاصل کرتے ہیں۔ تو نتیجہ صاف ہے کہ ان میں
خالق و مخلوق کا رابطہ ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ کسی مطلب کے لئے بھی ایسے پرمیشر سے خوشامد
کیا جو مطلق اس بات پر قادر نہیں کہ رحم اور عفو کر سکے۔ پھل کرموں کا ضرور بھگتنا پڑے گا۔
مکتی اپنے کرموں پر منحصر ہے تو پھر خدا کی کیا ضرورت اور اُس سے کسی قسم کی امید کیا۔
افسوس کہ آپ خدا تعالےٰ سے ایسے بدظن ہو گئے ہیں کہ وہ نیست سے ہست نہیں
کر سکتا۔ وہ کسی پر فضل و کرم نہیں کر سکتا۔ اسکی قدرت محدود ہو گئی۔ نہیں یاد رکھو وہ قادر مطلق
ہستی ہے۔ وہ غیر محدود ہستی ہے۔ اور اسکی سب صفات حسنہ ہیں اور غیر محدود ہیں۔ افسوس
کہ آپ صفات الٰہی کو ناقص مادی عقل سے پرکھنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھو کہ ناقص میں
نقص ہوتا ہے وہ ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ اگر مجرد عقل کے پیچھے پڑے رہے تو یہ عقل
دہریت تک پہنچا دیگی اور سچ تو یہ ہے کہ مادی عقل قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔ اس کے نتائج
بدلتے رہتے ہیں۔ عقل کسے کہتے ہیں۔ عقل وہ ہے جو جب بار بار کے تجربہ سے ایک
ہی نتیجہ مترتب ہوتا دیکھتی ہے تو اُس پر جم جاتی ہے۔ مگر جب وہ نتیجہ پیدا نہ ہو تو جھٹ
کہدیتی ہے کہ وہ غلط تھا۔ کون نہیں جانتا کہ اس زمانہ سے پہلے یونان کا فلسفہ زور پر تھا
سب عقلیں اُسے قبول کرتی تھیں۔ بڑے بڑے فلاسفر مانتے تھے۔ مگر آج بہت سی
باتیں باطل ثابت ہوئی ہیں۔ اور ہم حیران ہوتے ہیں کہ وہ فلاسفر کس طرح انہیں مانتے
تھے۔ پس جب عقل ایک بات پر قائم نہیں رہتی تو اس کا اعتبار کیا۔ اور پھر جس عقل
کو یہ تجربہ ہی نہیں کہ روح اور مادہ کی ماہیت کیا ہے تو اس کا فتوےٰ کیونکر لگ سکتا ہے
کہ عقل کے نزدیک یہ امر محال ہے کہ نیست سے ہست ہو جائے۔ البتہ یہ اللہ تعالےٰ کا

احسان ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب مسلمانوں کے ہاتھ میں دیدی ہے کہ وہ ہر زمانہ میں ہر فلسفہ کے لئے کافی ہوتی ہے یونانی فلسفہ کو حضرت امام غزالی علیہ الرحمۃ نے توڑا اور آج اُسی کتاب کے ذریعہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب علیہ السلام جنکا میں ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ سائینس کی دہریت کو پاش پاش کر رہے ہیں۔

سوال کیا جاتا ہے کہ اگر خدا قادرِ مطلق ہے تو کیا وجہ کہ وہ بعض ایسے افعال پر قادر نہیں۔ مثلاً وہ اپنے جیسا دوسرا خدا پیدا نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے آپ کو ہلاک نہیں کر سکتا شراب نہیں پیتا۔ زنا نہیں کر سکتا۔ مگر یاد رہے کہ خدا تعالےٰ کی نسبت ایسا خیال کرنا سخت گستاخی ہے۔ وہ تو ازلی ابدی حیی و قیوم ہستی ہے۔ وہ اپنی نسبت کوئی نقص گوارا نہیں رکھ سکتا۔ یہ تو نقص ہیں جس سے اُسکی خدائی ٹوٹتی ہے۔ انہی نقائص کے نہ ہونے سے وہ خدا کہلاتا ہے۔ اگر یہ نقص اُس میں موجود ہوں (نعوذ باللہ) تو پھر وہ خدا کہلانے کے مستحق نہ رہے۔ اُس میں اور غیر اشیا میں یہی فرق ہے۔ جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مخلوق ہیں اور از خود قائم نہیں۔

ایک یہ سوال کیا جاتا ہے کہ روح اور مادّہ کے پہلے خدا کس چیز کا مالک تھا۔ اور وہ بیکار تھا یا کیا کرتا تھا۔ سو واضح ہو کہ یہ مسئلہ فریقین میں مسلم ہے کہ خدا ازلی ابدی باعلم بااراده ہستی ہے۔ پس اسکی صفات اسکی ذات کے ساتھ ازلی ابدی ہیں۔ وہ ازلی ابدی طور پر ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ ہاں یہ ہم نہیں بتا سکتے کہ اس خلقت سے پہلے کس قسم کی خلقت تھی۔ اور پھر علاوہ اِس کے وہ علم اور ارادہ کا مالک تھا جیسا اب ہے۔ جس وقت چاہتا ہے اُس علم اور ارادہ کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے۔ محو کر دیتا ہے۔ اس پر تشریح کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنی ذات پر غور کرنے سے اسکو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

ایک منطقی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ جب ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ روح اور مادّہ مخلوق ہیں۔ محض ارادہ الٰہی سے پیدا ہوئے ہیں یعنے عدم سے وجود میں آ گئے ہیں۔ تو اِس بات کے سمجھنے میں کیا دقت پیش آ سکتی ہے کہ جب وہ عدم سے ارادہ الٰہی سے موجود ہوئے ہیں تو محض منشائے الٰہی سے معدوم بھی ہو سکتے ہیں۔

پس مختلف پہلوؤں پر غور کرنے سے ثابت ہو گیا کہ روح اور مادّہ مخلوق ہیں اور کسی صفت میں خدا تعالےٰ کے شریک نہیں ہیں۔ البتہ یہ ہم نہیں بتا سکتے کہ وہ کس طرح وجود پذیر ہوئے۔ اسکی وجہ میں عرض کر آیا ہوں۔ لہذا تکرار بیفائدہ ہے۔ مگر واضح رہے کہ عدم علم سے عدم شے لازم نہیں آتا۔ بہت سی باتیں ہیں جو ہم نہیں سمجھ سکتے مگر عقل سلیم رہنمائی کرتی ہے کہ وہ حق ہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ للہ ما فی السّماوات والارض۔ کلّ للہ قانتون +
بدیع السماوات والارض۔ واذا قضےٰ امراً فانّما یقول لہٗ کن فیکون +
زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ دلیل اسپر یہ ہے کہ وہ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ اور چونکہ وہ اس کے تابع ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ وہ انکا پیدا کنندہ ہے۔ پس جب وہ پیدا کنندہ ہے تو وہ اس بات پر قادر ہے کہ جب کسی امر کے واسطے کہتا ہے کہ ہو جا وہ ہو جاتا ہے۔ آناً فاناً یا بتدریج جیسا منشاء الٰہی ہو۔

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار۔ وھو اللطیف الخبیر۔ آنکھیں اُسے ادراک نہیں کر سکتیں۔ وہ آنکھوں کو ادراک کرتا ہے۔ کیونکہ لطیف الخبیر ہے۔ ہماری عقل ناقص اُسکی قدرتوں کا اندازہ نہیں کر سکتی اور اُس کے بھیدوں کو نہیں سمجھ سکتی

کیا وہ خدا اتنا ہی ہے جتنا ہم نے یا آپ نے سمجھا ہے - نہیں بلکہ اُسکی قدرتیں لاانتہا ہیں - روح اور مادّہ میں جو اوصاف ہیں اسی کے دئے ہوئے ہیں تبھی تو وہ انکو سمجھتا ہے - لطیف الخبیر ہونا اوس کا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان کا خالق ہے ورنہ وہ انکی کنہ کو کیسے سمجھ سکتا ہے -

لا یحیطون بشیءٍ من علمہٖ الّا بما شاء - کوئی چیز اسکے علم کا احاطہ نہیں کرسکتی ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا اُس نے دیا ہے - اُس کے ورے ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے -

نخلق کلّ شیءٍ فقدرہٗ تقدیرا - اُسی نے ہر ایک کو ایک اندازہ پر رکھا ہوا ہے جو دلیل ہے اس بات پر کہ وہ ان سب کا خالق ہے -

اللہ خالقُ کل شیءٍ و ھو الواحد القھار - وہ کل چیزوں پر متصرف ہے - لہذا وہ واحد ہے - جب واحد ہوا تو خالق بھی ہوا -

یسئلونک عن الروح - قل الروحُ من امر ربّی - روح کی نسبت سوال کرتے ہیں - اِن کو کہدے کہ جیسے کل اشیا محض امر ربی سے ظہور پذیر ہوئی ہیں - یہ بھی امر ربّی کا پرتو ہے -

لہٗ الاسماء الحسنیٰ - ذات باریتعالےٰ کل نیک صفات کی جامع اور جمیع نقصوں اور بدیوں سے منزہ ہے -

الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم - مالک یوم الدین - حقیقی حمد کے لائق وہی معبود ہے جو ہر صفت میں واحد ہے - وہ معبود ازلی ہے کیونکہ اُس کی صفات اُسکی ذات کے ساتھ ازلی ہیں اور ازلی طور پر عالم شہود میں ظہور پذیر رہی ہیں - وہ کُل عالموں کا رب ہے جنکا یہ دنیا مرکز ہے - لکھوکھا عالم ہوں - مگر وہ محدود ہیں - فلاسفروں کے مختلف گروہ ہیں -

چنانچہ ایک گروہ نے ثابت کیا ہے کہ ہماری دنیا کل کائنات کا مرکز ہے*۔ وہ رب العلمین ہے۔ یعنے وہ سب کا خالق ہے۔ اور خلقت کر کے بتدریج فقدرہ تقدیر کے مقام تک پہنچانیوالا ہے۔ وہ رحمٰن ہے۔ انسان کو پیدا کرنے سے پیشتر اُس نے کُل سامان اس کے آسائش کے موجود کردئے تھے۔ یہ اسکا فضل عام ہے۔ اسمیں کل قومیں کل مذہب شامل ہیں۔ وہ رحیم ہے یعنے وہ ہمارے نیک افعال پر صحیح نتیجہ مترتب کرنیوالا ہے۔ ہم انتظام دنیا میں جو جزا و سزا دیکھتے ہیں۔ اسمیں نقص کا رہ جانا ممکن ہے۔ مگر خدا تعالےٰ کی ذات سے ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ رحم کے تحت میں جو عفو کی صفت ہے اُسکو بھی انصاف سے عمل میں لاتا ہے اور لائیگا۔ البتہ مشرک کے واسطے عفو نہیں ہوسکتی۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء۔ ومن یشرک باللہ فقد ضل ضلالاً بعیدا + اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ شرک کو معاف نہیں کریگا علاوہ اسکے جو گناہ مثلاً خفیف ہو یا سہواً سرزد ہوا ہو اسکو بصفت انصاف بخش دیگا۔ وجہ اسکی یہ بتلائی ہے کہ جو شخص شرک کرتا ہے۔ وہ راستی سے بہت دور گمراہی میں پڑا ہوا ہے پس وہ پوری سزا بھگتے بغیر جہنم سے آزاد نہیں کیا جائیگا۔ جہنم ایک House of Correction ہے۔ جہاں سب آلودگیاں دھوئی جائیں گی۔ اس کے بعد جہنم خالی ہوجائیگا[ع۱] اور سب کے سب بتدریج راحت

* See "Mans place in the universe" by Dr wallace Reviewed in Review of Review of 1904

ع۱ قرآن شریف میں بہشتی زندگی کے واسطے عطاءً غیر مجذوذا آیا ہے۔ مگر دوزخ کے متعلق کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس سے کبھی رہائی نہیں ہوگی۔ فاما الذین شقوا ففی النار لھم فیھا زفیر وشھیق۔ خالدین فیھا مادامت السموات والارض الا ما شاء ربک۔ ان ربک فعال لما یرید + واما الذین سعدوا ففی الجنۃ خالدین فیھا مادامت السموات والارض الا ما شاء ربک۔ عطاءً غیر مجذوذ + علاوہ ازین ایک حدیث ہے۔ یاتی جہنم زمان لیس فیھا احد ونسیم الصبا تحرک ابوابھا + یعنی جہنم پر ایک وقت آئیگا کہ اسمیں کوئی نہیں ہوگا اور نسیم صبا اسکے دروازوں کو کھٹکھٹائے گی۔

کی حالت میں پہنچ جائیں گے۔ خدا کے ناموں میں معذب کوئی نام نہیں پس جہنم مقام تعذیب ہے نہ عذاب۔ اور پھر وہ مالکِ یوم الدین ہے۔ اس دنیا میں انتظام کے لحاظ سے ہم ایک دوسرے کو تعذیب کرتے ہیں۔ مگر وہ تعذیب چونکہ ہم عالم کل نہیں ناقص ہے۔ یوم الدین کو کسی غیر کا دخل نہیں ہوگا۔ بلکہ ذات باری کل فیصلہ انصاف سے کریگا۔

شاید آپکے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ پھر کیا خدا بیکار ہو جائیگا ہم کہتے ہیں نہیں۔ اس نے اپنی صفت ازلی سے بے انتہا عالم پیدا کئے بے انتہا کریگا۔ یہ کارخانہ اسکی ذات کے ساتھ قائم رہیگا اُس نے ہمیں بتایا ہے کہ اسکے بعد خلقاً جدید ہوگی۔ مگر وہ خلقاً جدید کیسی ہوگی۔ اسکا علم اُسی کو ہے انسان ضعیف البنیان (خلق الانسان ضعیفاً) کیا سمجھ سکتا ہے۔

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں پنڈت کروڑوں دانا ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا جو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علےٰ رسولہٖ الکریم

تقریر دوم

تناسخ

حاضرین مجلس - گزشتہ ہفتہ کی بحث میں ماسٹر آتما رام صاحب نے افتتاحی تقریر فرمائی تھی - جسمیں انہوں نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی کہ انسانکی موجودہ زندگی کی حالت کسی پہلی زندگی کے افعال پر مبنی ہوتی ہے - اور اسپر انہوں نے اپنے زعم میں آٹھ عقلی دلائل پیش ہے

اوّل - جنم اندھے اور لنگڑوں وغیرہ کا پیدا ہونا -

دوم - بعض لڑکوں کا چھوٹی عمر میں حد سے زیادہ ذہانت ظاہر کرنا -

سویم - موت کے بعد روح کے لئے کوئی جائے قرار نہ ہونا -

چہارم - یہ کہ اسلامی عقیدے کے مطابق مجرد زندگی کے بعد دوزخ اور بہشت میں ابدی جزا و سزا کا ہونا قابل تسلیم نہیں -

پنجم - مسئلہ شفاعت خلاف عقل ہے -

ششم - رحم اور عدل متضاد صفات ہیں -

ہفتم بخشش گناہ کے لئے دعا عبث ہے -

ہشتم - تمام بیدار مغز آدمی تناسخ کو مانتے آئے ہیں -

یہ آٹھ ۸ باتیں ہیں جو انہوں نے دعوے تناسخ کو ثابت کرنے کے لئے بیان فرمائیں مگر اگر بنظر غور دیکھا جائے تو اُن میں سے چار تو مسئلہ تناسخ کے متعلق ہیں - مگر باقیماندہ چار میں اُنہوں نے بعض اسلامی عقائد پر اعتراض کر کے تناسخ کو چھپانا چاہا ہے گو ہماری طرف سے چند مختصر الفاظ میں بیان کر دیا گیا تھا کہ گناہ سے عفو کے کیا معنے ہیں - رحم اور عادل کسے کہتے ہیں اور شفاعت کیونکر جائز بلکہ معقول ہے - اور بہشتی اور دوزخی زندگی اسلام میں کس طرح مانی جاتی ہے - مگر میں چاہتا ہوں کہ چونکہ ہمارا مضمون بحث تناسخ ہے - اس لئے صرف اسی مسئلہ تک اپنی تقریر کو محدود رکھوں - گو یہ بھی ایک طریق ہے کہ مخالف اعتقادات کی تردید سے اپنے عقائد کی صداقت ثابت ہو جاتی ہے - مگر مختلف شاخوں کے درمیان میں لانے سے اصلی مضمون گم ہو جاتا ہے - البتہ اگر مثلاً تناسخ پر بحث ہونیکے بعد یہ مضمون مقرر کیا جائے کہ موت کے بعد انسان کی کیا حالت ہوتی ہے - تو اس صورت میں ہم اپنے اعتقادات پیش کریں گے اور عقلی اور نقلی دلائل سے پایہ ثبوت کو پہنچائیں گے -

ماسٹر صاحب کی یہ دلیل کہ تمام بیدار مغز آدمی تناسخ کو مانتے ہیں - ایک بودی دلیل ہے - دنیا میں کوئی عقیدہ ایسا نہیں جسکو بظاہر بعض عقلمند آدمیوں نے نہ مانا ہو - مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مسئلہ ضرور صحیح ہو - شاید آپ کا یہ مطلب ہے کہ جو آدمی تناسخ کو مانتے ہیں - وہی بیدار مغز ہیں - باقی سب کا مغز سویا ہوا ہے - مگر کیا آج کل یورپ اور امریکہ میں جو سینکڑوں اور ہزاروں سائنس دان اور فلاسفر ہیں - جنہوں نے اسقدر علوم دریافت

کئے ہیں اور آئے دن نئی نئی ایجادیں کرتے ہیں۔ اور جو تناسخ کو نہیں مانتے۔ وہ سب کے سب کوڑ مغز ہیں۔ بلکہ اگر تناسخ ہی کے ذریعہ یعنے اِس وجہ سے کہ انہوں نے گزشتہ حیات میں نیک کام کئے۔ انکو دنیا میں ذہانت ملی اور جاہ وحشمت ملی۔ پھر اگر وہ تناسخ نہ مانیں تو معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ تناسخ غلط ہے۔ اور پھر آپ ہمارے سامنے اُن بیدار مغز لوگوں کو پیش کرتے ہیں۔ جنکا فلسفہ اور سائنس آج کئی باتوں میں غلط ثابت ہو چکا ہے۔ بس ہمیں کس طرح معلوم ہو کہ تناسخ کا ماننا اُن کا صداقت پر مبنی تھا۔ آپ نے گورو نانک صاحب کی مثال دی۔ مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ وہ پکے موحد تھے اور روح اور مادہ کو ازلی وابدی نہیں مانتے تھے۔ لہٰذا وہ تناسخ کے قائل نہیں ہو سکتے۔

ماسٹر صاحب کا یہ سوال کہ مرنے کے بعد روح کہاں رہتی ہے۔ اور خود ہی یہ نتیجہ نکال لینا کہ اُس کے واسطے کوئی جائے قرار نہیں۔ اور سمجھ لینا کہ تناسخ درست ہے۔ یوں رد ہو جاتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیوں صاحب۔ اگر روح کے واسطے کوئی جائے قرار نہیں تو آپ کے نزدیک مکتی کس چیز کا نام ہے۔ آپ مانتے ہیں کہ مکتی سے تناسخ کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ گو چند عرصہ کے لئے ہی سہی۔ تو روح جب مکتی کی حالت میں مادہ سے الگ رہے گی تو وہ کہاں رہے گی۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ جس چیز پر قرار واقعی علم نہ ہو اُس پر ایمان لانا نہیں چاہئے۔ تو یہ سوال کہ مادہ سے الگ روح کہاں رہ سکتی ہے۔ یہ تو تناسخ کے ماننے سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ پس جبتک آپ یہ جواب نہ دیں کہ مکتی کی حالت میں روح مادہ سے الگ کہاں رہے گی۔ آپ تناسخ سے منکر ہیں۔ اور اگر بتا دیں۔ تو اِس بات کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں رہتی کہ مرنے کے بعد روح کہاں رہے گی۔

ایک یہ سوال ہے جنم اندھے کیوں ہوتے ہیں۔ اصل میں ایسے سوالات جیسا کہ

میں نے گزشتہ ہفتہ میں ذکر کیا تھا- ایک ہی سوال کی شاخیں ہیں- وہ عام سوال یہ ہے
کہ دنیا میں تفرقہ کیوں ہے- اِس کا جواب میں نے کسی حد تک دیا تھا اور ظاہر کیا تھا کہ یہ
تفرقہ اِس وجہ سے نہیں کہ کل مخلوقات عالم نے گزشتہ زندگی میں غلط کاریاں کی ہوئی ہیں
بلکہ یہ تو ظاہری نظام عالم ہے- معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دوستوں کی اِس سے تسلی نہیں ہوئی
لہذا آج میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے خیالات کو اور پہلو سے ادا کروں-

میرا خیال تھا کہ مسئلہ تناسخ دو طرح پر مانا جاتا ہے- ایک تو یہ کہ انسان مر کر کسی حیوان
کی جون میں جاتا ہے- اور دوسرا یہ کہ انسان سے پھر انسان ہی بنایا جاتا ہے- مگر گزشتہ
ہفتہ ہمارے ایک آریہ دوست نے میری غلطی کو درست کر دیا اور کہا کہ یہ نہیں کہ انسان انسانیت
سے گزر کر انسان یا حیوان ہی بن جاتا ہے- بلکہ اُسکی روح ساگ پات میں بھی حلول کر جاتی
ہے- چہ خوش! ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ نباتات وغیرہ ہماری خدمت کے لئے ہیں اور
ان سے ہماری زندگی کا سہارا ہے- اور ہر انسان سمجھ سکتا ہے کہ حقیقت میں یہی بات ہے
مگر اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ نباتات کا ہونا ہماری موت پر منحصر ہے- مگر یہ تو ایسی ٹیڑھی ترکیب
ہے کہ ہرگز قابل تسلیم نہیں- نباتات کو انسان سے کچھ مناسبت نہیں- ایک موسم آتا ہے
تو مثلاً انسان گندم بوتا ہے اور ایک ہی کھیت میں اتنے پودے ہو جاتے ہیں کہ ساری
قریہ کی اتنی آبادی نہیں ہوتی- یا شاید یہ مطلب ہو کہ روح انسانی جسم سے خارج ہو کر اُڑتی اُڑتی
کسی پودے میں گھس جاتی ہے- اور جب وہ پودہ مرد یا عورت کھاتے ہیں تو وہ روح
ان میں داخل ہو جاتی ہے- مگر اسے بھی عقل قبول نہیں کر سکتی- مثلاً فرض کرو کہ کوئی انسانی
روح کسی شلجم میں حلول کئے بیٹھی ہے- اب ہم اُس شلجم کو کھاتے ہیں تو اس طرح کھاتے
ہیں کہ اول اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور پھر اسمیں مرچ مصالح ڈالکر گھنٹوں پانی میں

ڈالکر رگ پہ لگاتے رہتے ہیں۔ تو کیا اس صورت میں وہ روح مر نہیں جاتی غرض اس قسم کے خیالات صرف توہمات ہیں۔
اصل میں کل کائنات کیطرف غور کرنیسے معلوم ہوتا ہی کہ یہ سب نظام ظاہری ہی اور ایک حکمت پر مبنی ہے۔
اوپر کی طرف دیکھئے ہزاروں ہزار ستارے یا سیارے ہیں کوئی بڑا ہی کوئی چھوٹا ہے۔ کوئی خود روشن ہے
اور دوسرے انکو روشنی پہنچاتا ہی کسی میں آبادی ہے اور کسی میں آبادی کے اسباب پیدا نہیں ہوئے۔ اسی طرح اس زمین میں
خالص مادہ سے شروع ہو کر حیوانی حالت تک کل کائنات میں فرق بین پایا جاتا ہی۔ پس اگر وہی فرق انسانوں میں
پایا جائے تو دلیل تناسخ کیوں ٹھیرے۔ اگر آپ تفرقہ انسانی کو دلیل تناسخ ٹھیراتے ہیں۔ تو ہمیں بتا جائے کہ اور
کائنات میں جو فرق ہے وہ کن گزشتہ اعمال کا نتیجہ ہے۔

کل کائنات پر مجموعی طور پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ روح تو ہر شے میں ہی۔ ہر چیز کا تغیر پذیر ہونا اس امر کی
دلیل ہی کہ اُس میں روح یا کوئی طاقت ہے۔ مگر یہ روح ہر قسم میں مختلف ہے مثلاً عام قاعدہ کی رو سے کائنات تین
حصوں پر تقسیم کیجاتی ہے۔ جمادات نباتات اور حیوانات۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اِن تینوں کی روح میں فرق ہے
جو اُنکے افعال سے ظاہر ہی۔ یہ مسلم امر ہی کہ جس قسم کی روح ہوتی ہی۔ اُسی قسم کے افعال ہوتے ہیں۔ اب جس قسم
کے افعال حیوانات سے سرزد ہو سکتے ہیں اُس سے عالم نباتات عاری ہی اور جو افعال نباتات میں نظر آتے ہیں
وہ جمادات میں نہیں پائے جاتے۔ مگر باایں ہمہ تینوں قسموں میں ظاہری اور باطنی اسباب کا اثر ہوتا ہے جس سے وہ
مختلف رنگ اور شکل کے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جمادات میں مٹی کو لیجئے۔ اسمیں ظاہری آب و ہوا کا اثر اور
باطنی جائے قرار کا اثر اس طرح ہوتا ہی کہ وہ اُس سے مختلف شکلیں پکڑ لیتی ہے جنکا نام ہم علیحدہ علیحدہ
رکھ لیتے ہیں کسی کو ریت کہتے ہیں اور کسی کو پتھر۔ سنگ مرمر۔ زمرد۔ وغیرہ۔ نباتات بھی خاص
زمین کے اثر اور ظاہری آب وہوا کے اثر سے مختلف ہو جاتے ہیں مثلاً عام فہم مثال آم کی ہے۔ ہیں
تو سب آم ہی۔ مگر درختوں میں خاص زمین اور آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے جس سے وہ
مختلف ہیں۔ اور ان کے پھل بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ کوئی پھیکا ہے اور کوئی ترش

اور ٹھیا۔ اس سے گزر کر حیوانات میں آتے ہیں جنہیں حضرت انسان بھی شامل ہے۔ انہیں بھی جیسا اور مخلوقات عالم کا حال ہے ظاہری اور باطنی اسباب کا اثر ہونا چاہئے اور ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی آخر اُسی نیچر کے قانون کے ماتحت ہیں جو دیگر چیزوں پر حائل ہے۔ پس اِن میں بھی اُن اندرونی اور بیرونی اسباب کے ذریعہ شکل میں فرق پڑجاتا ہے۔ جس سے بعض حیوان لنگڑے لولے اندھے کانے ہوجاتے ہیں اور کوئی صحیح العضو رہتے ہیں۔ کوئی فہیم اور ذکی ہوتے ہیں اور کوئی غبی۔

یہاں تک کل مخلوقات عالم کا ایک ہی حال ہے۔ یعنے اختلاف قبول کرنے میں وہ سب ایک ہی قانون نیچر کے ماتحت ہیں۔ یعنے انسانوں کا مختلف شکلیں دھارنا بھی اُسی قانون کے ماتحت ہے۔ یہ بات کہ ظاہری اور باطنی اسباب کس طرح اثر کرتے ہیں۔ ایک دو تمثیلات سے واضح طور پر کھل جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بعض میدانوں کے ایسے پودے ہیں جو پہاڑوں میں نہیں پیدا ہوتے۔ اور بعض ایسے پہاڑی درخت ہیں جو نیچے میدانوں میں نشوونما نہیں پاسکتے۔ اور بعض کو زمین اور آب وہوا ایسی ملتی ہے کہ وہ پورا قد نہیں نکال سکتے یا جلدی اپنی قسم کے اور درختوں سے پہلے مرجاتے ہیں اور گل سڑ جاتے ہیں۔ بعض پودے ہندوستان میں اور اس کے مختلف حصوں میں ایسے پائے جاتے ہیں جو اور ملکوں میں نہیں۔ اور بعض اور ملکوں میں ایسے ہیں جو یہاں موجود نہیں۔ یہی حال حیوانات کا ہے مثلاً بہت سے حیوان افریقہ میں ایسے ہیں (Zebra زبرا وغیرہ) جو اور ملکوں میں نہیں پائے جاتے۔ اور بعض برفانی ملکوں سے مخصوص ہیں جیسے سفید ریچھ گنی کے Paradise bird اُسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ افریقہ کے باشندے سیاہ فام اور ظاہرا مکروہ

قطع وضع کے ہوتے ہیں۔ یورپ وغیرہ کے باشندے سفید رنگت کے اور خوبصورت اور ایشیا کے رہنے والے کچھ سرخی نما ہوتے ہیں۔ اور جیسے دیگر مخلوقات عالم میں ظاہری آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے اور گرد و نواح کی چیزوں کا اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح اِن میں بھی وہ اثر ضرور ہوتا ہے۔

غرض یہاں تک کل مخلوقات عالم جسے ہم عام اصطلاح میں ذی روح اور غیر ذی روح کہتے ہیں۔ اِن سب کا ایک ہی حال ہے وہ سب ایک تقدیر میں۔ ایک خاص دائرے میں محدود ہیں۔ اور ظاہری اور باطنی تاثیرات نیچر سے مختلف رنگ اور قطع وضع کے ہیں۔ اس صورت میں عقل سلیم ہرگز تسلیم نہیں کر سکتی۔ کہ ایک روح مثلاً یہاں سے ایک خاص جسم قبول کرنے کے لئے افریقہ جاتی ہے یا برفانی ملکوں کی طرف مشرقی اور جنوبی قطب تک پرواز کرتی ہے۔ کیونکہ وہ جانور یہاں نہیں پائے جاتے۔ بلکہ کل کائنات کی طرف مجموعی طور پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کل تفرقہ جمادات میں نباتات میں اور حیوانات میں ایک حکمت پر مبنی ہے اور کسی گزشتہ افعال کا نتیجہ نہیں۔ ہاں اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ انسان میں ایک فہم اور ادراک پایا جاتا ہے۔ حقیقت میں اسی سے وہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اس قابل ہے کہ اُس کے افعال پر جزا و سزا کا نتیجہ مترتب کیا جائے۔ کیونکہ اس سے وہ نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے۔ دیگر مخلوقات میں خواہ وہ عام اصطلاح میں ذی روح ہوں یا غیر ذی روح۔ یہ فہم جسے انگریزی میں Reason اور Moral sense سے موسوم کرتے ہیں۔ نہیں پائے جاتے۔ اسی لئے انہیں مستحق جزا و سزا ٹھیرانا جائز نہیں۔

اس تقریر سے ثابت ہو گیا کہ انسانوں میں تفرقہ ہونا قانون نیچر کے ماتحت ہے اور ہر

انسان اپنی تقدیر میں مجبور ہے - مگر بااین ہمہ وہ فعل مختار ہستی ہے - مگر اسکا فعل مختار ہونا اسی تقدیر مجبوریت سے وابستہ ہے - اس تقدیر سے باہر وہ کوئی کام نہیں کرسکتا - اور جو کام وہ اپنی تقدیر کے دائرہ میں نیک یا بد کرتا ہے - اسی کے مطابق اسے جزاوسزا ہوتی ہے - یعنے وہ پورا مجبور بھی نہیں اور پورا فعل مختار بھی نہیں - یہ بات ایک معمولی مثال سے بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے - اب مثلاً میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں - میرے اختیار میں ہے کہ میں ایک پاؤں اٹھالوں - مگر دوسرا اُس کے ساتھ ہی اُٹھا نہیں سکتا - گویا ایک طرز پر میں مختار ہوں اور دوسرے پہلو سے مجبور - اب رہی یہ بات کہ انسان کے افعال قابل جزاوسزا کیوں ہیں - سو اوّل تو جیسا میں نے بیان کیا - اس میں ایک فہم اور حسِ خلق ہے اِس کے ساتھ اسے اِن دونو صفات کے استعمال کرنے کا اختیار ہے - اب جب اختیار حاصل ہے تو صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ اُس کے افعال پر کوئی نتیجہ ضرور مترتب ہوتا ہے غرض اگر انسان اپنی قوت مدرکہ سے یہ خواہش کرے کہ میں اندھا ہوں تو بینا ہو جاؤں - یا غبی ہوں تو تیز حافظہ پیدا ہو جائے - یا اگر غریب ہوں تو بادشاہ بن جاؤں ہرگز اس امر کی دلیل نہیں کہ کبھی گزشتہ زندگی میں اُسے یہ سب حاصل تھیں یا آیندہ ہو جائیں گی - کیونکہ انسان تو اپنی وسعت خیال سے بہت کچھ خواہش کرسکتا ہے - مثلاً ہر فرد ذرا سوچے تو اُسے یاد آئے گا کہ بعض موقعے اُس پر ایسے گزرے ہیں - جو اُس نے چاہا ہے کہ دم زدن میں کہیں کا کہیں چلا جائے - آسمانوں کی سیر کرے - یا مختلف ستاروں کی کیفیت دیکھے - یا یہ کہ اُس کے پاس مٹی ہے تو سونا بن جائے - وغیرہ وغیرہ مگر عقل ہرگز تسلیم نہیں کرسکتی کہ اُسے کبھی یہ قوت حاصل ہوگی یا ہو جائیگی -

اسلام نے اِس بات کو کہ انسان مستحق جزاوسزا کیوں ہے - اس طرح بیان کیا ہے

کہ اُس میں دو قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں - ایک وہ جو نیکی کی طرف کشش کرتی ہے اور ایک وہ جو بدی کی طرف کھینچتی ہے - پس Reason اور Moral sense کے ہوتے ہوئے جدھر وہ جُھکتا ہے - تو چونکہ فعل مختار ہستی ہے - ویسا ہی اس کے افعال کی جزا و سزا ہوتی ہے - جیسے اشارہ فرمایا - فالھمھا فجورھا وتقوھا - یعنے انسان میں نیکی اور بدی کی قوت ودیعت کی گئی ہے قرآنی اصطلاح میں قوت داعی الے الشر کو شیطان کہتے ہیں - یہ نہیں کہ شیطان ایک وجود ہے جو باری باری ہر انسان کے پاس جاکر اُسے ورغلاتا ہے - شیطان شطن بمعنے فریب ہے - پس جو قوت اُسے فریب دیتی ہے اور بدی کی جانب راغب کرتی ہے - وہی شیطان ہے - داعی الے الخیر کو قرآنی اصطلاح میں روح القدس سے موسوم کرتے ہیں - جیسے فرمایا اولٰئک کتب فی قلوبھم الایمان و ایدھم بروح منہ - یعنے جو لوگ دل میں ایمان رکھتے ہیں انکو روح القدس سے مدد ملتی ہے - پس نیکی طرف رغبت روح القدس کی تائید سے ہوتی ہے - پس اس لحاظ سے انسان تین قسم کے ہوتے ہیں - ایک وہ جو بکلی نیکی کی طرف جُھک جاتے ہیں - اور ان پر شیطان کا غلبہ نہیں رہتا - جیسے فرمایا - ان عبادی لیس لک علیھم سلطان - یعنے جو خدا کے بندے ہیں ان پر بدی کی قوت غالب نہیں آسکتی - اور ایک وہ جو بدی میں مستغرق ہو جاتے ہیں - انمیں نیکی کی قوت مفقود ہو جاتی ہے - جیسے فرمایا ختم اللہ علے قلوبھم یعنے اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے - اس پر ماسٹر آتمارام صاحب نے اعتراض کیا تھا - مگر آپ ذرا سوچیں - یہ قانون تو عین قانون نیچر کے مطابق ہے - یہ ظاہر ہے کہ کل طاقتیں خدا تعالےٰ کی طرف سے ہیں - پس اسی دلیل سے وہ یہ فعل اپنی طرف منسوب کرتا ہے - یہ بات ایک مثال سے بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے - مثلاً یہ میرا ہاتھ ہے - میں جانتا ہوں کہ

یہ قابل استعمال عضو ہے اور اس سے کام لیتا ہوں۔ مگر اگر میں اسکو بیکار چھوڑ دوں اور
ایک عرصہ تک اُسے اونچا اُٹھائے رکھوں تو خدا یا خدا کا قانون اُس پر یہ نتیجہ قائم کر دے گا
کہ وہ بالکل سوکھ جائے اور قابل استعمال نہ رہے۔ پس یہی حال دل اور دیگر باطنی قوے کا
ہے۔ وہ دل جو کبھی خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور بدی میں مشغول رہتا ہے۔ آخرش ایسا
ہو جاتا ہے کہ اس سے نیکی کا خیال مفقود ہو جاتا ہے۔ اور وہ دل جو خدا کی یاد میں مصروف
ہے اور نیکی کی طرف مائل رہتا ہے۔ آخر ایسا ہو جاتا ہے کہ بدی اسمیں دخل نہیں پا سکتی۔
اور یہ دل نجات یافتہ ہوتا ہے۔ غرض تیسری قسم کے انسان وہ ہیں جو ان دونو حدّوں
کے بین بین ہیں۔ جو کبھی نیکی بھی کرتے ہیں۔ مگر شیطان کی زد کے نیچے ہوتے ہیں اور
بدی بھی کر بیٹھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حصہ دنیا میں زیادہ ہے۔

میں اپنی پہلی تقریر میں بیان کر چکا ہوں کہ حقیقی راحت دولت و دنیا پر منحصر نہیں۔ بلکہ
اُس کے حاصل کرنیکے اور ہی ذرایع ہیں۔ اور بسا اوقات ایک بادشاہ کو تخت پر وہ خوشی
نہیں ہوتی جو ایک غریب کو اپنی جھونپڑی میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات کہ انہیں حقیقی راحت
ملتی ہے یا نہیں۔ دوسرا سوال ہے۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ ہر مذہب و ملت میں بعض
افراد ایسے ہیں جو میرے بیان مذکورہ کی تائید کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں ایسے اشخاص کی
کثرت ہے۔ اور انکی قبریں تک گواہی دے رہی ہیں۔ ہندوؤں میں بھی ایسے آدمی ہوئے
ہیں۔ اور سکھوں میں بھی۔ چنانچہ مجھے ایک مثال یاد آ گئی۔ وہ یہ کہ غالباً بیس یا بائیس
برس کا عرصہ ہوا جب میں ایک دیہاتی پرائمری مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ وہاں ایک باوا
دھیان سنگھ آئے۔ ان کے ہزاروں چیلے تھے۔ وہ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے بچشم خود
دیکھا ہے کہ وہ اس شدت تپش میں اپنے چاروں طرف بہت ساری آگ جلائے رکھتے تھے

اور رات دن اُسی آگ کے بیچ میں آسن جمائے بیٹھے رہتے تھے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے
کہ وہ اس عمل سے تکلیف میں تھے اور یہ انکی گزشتہ زندگی کی بدکرداریوں کا نتیجہ تھا۔
ہرگز نہیں۔ بلکہ میں نے خود دیکھا ہے کہ ان کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ وہ ہر وقت
ایک ذکر میں محو معلوم ہوتے تھے اور اسی میں ان کی خوشی تھی۔ اور لوگ ان کی بہت سی
کرامتیں بیان کرتے تھے۔

رنج اور تکلیف لازمی طور پر مفلسی اور غریبی کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ قانع شخص
ہر حالت میں خوش رہتا ہے اور حریص کبھی سیر نہیں ہو سکتا مثل مشہور ہے۔ شعر

گفت چشم تنگ دنیا دار را یا قناعت پر کند یا خاکِ گور

دنیاوی جاہ و جلال کے لحاظ سے بادشاہ بڑا ہوتا ہے۔ مگر اسکو بھی چین نہیں۔ ایک ملک
کو تابع فرمان کر لیا ہے تو چاہتا ہے کہ دوسرا بھی لے لوں۔ دوسرا لیا ہے تو فکر ہے
کہ تیسرا بھی قبضہ میں آجائے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ غرض دنیا کا جاہ و حشم حقیقی راحت کا موجب
نہیں۔ حقیقی راحت کا تعلق دل سے ہے۔ ایسے خیالات اور ایسے ذرائع ہونے چاہئیں
جس سے ایمان باللہ کے ساتھ تسکین قلب حاصل ہو۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

پس ثابت ہوا کہ تفرقہ انسانی اس بات کا نتیجہ نہیں کہ کسی گزشتہ جنم میں طرح طرح
کے کرم کیے ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ تو ظاہری انتظام دنیا ہے۔ کیونکہ جب یہ ثابت ہے کہ حقیقی
خوشی حاصل کرنے کے لئے کوئی Social تفرقہ سد راہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ہرگز
قابل تسلیم نہیں کہ دنیوی مال و منال ہی باعث راحت ہے اور مفلسی لازمی طور پر عذاب ہے
یہ تو قانون قدرت ہے کہ آغازی حالت میں جیسا بعض افریقہ کی قوموں سے ظاہر ہے
Social تفرقہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر جوں جوں انسان ترقی کرتا ہے اور تہذیب کی طرف

آتا ہے۔ یہ تفرقہ بڑھتا جاتا ہے۔ مختلف پیشہ ور ہوتے جاتے ہیں۔ اور ان میں غریبی اور امیری کی حد لمبی ہوتی جاتی ہے۔

میں پہلی تقریر میں اس دلیل کی تردید کر چکا ہوں کہ دنیا میں کوئی چیز باہر سے نہیں آتی۔ بلکہ موجودہ اشیا ہی تغیر و تبدل ہوتی رہتی ہیں۔ اور اسکا دوہرانا ضروری نہیں سمجھتا action اور Reaction کا مسئلہ ہم بھی مانتے ہیں۔ یہ ہماری دنیا ایک action کی حالت میں ہے۔ اس وقت یہ زمین اپنی گرمی نکال رہی ہے اور اُدھر سے سورج کی تپش ہر لحظہ کم ہو رہی ہے۔ کسی وقت میں نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ اس قدر تپش کم ہو جائیگی کہ کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکیگا۔ اور تپش کے کم ہونے سے ہر دو وجود بلکہ اسی طرح اور وجود بھی ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے جائیں گے۔ حتےٰ کہ آپس میں ٹکرا جائیں گے۔ یہاں تک صرف action مگر اس ٹکرانے کے بعد Reaction پیدا ہوگا۔ اسی ٹکرانے سے زمین و آسمان یا اجرام فلکی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ قرآن شریف نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ وحُمِلت الارض والجبال فدُکّتا دکّۃً واحدۃ۔

یہاں تک میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانوں میں ظاہری تفرقہ کی وجہ کیا ہے۔ اور یہ کہ اس تفرقہ کو گزشتہ زندگی کے اعمال سے کچھ تعلق نہیں۔ اور نیز یہ کہ اسی ایک زندگی میں انسان نجات حاصل کر سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب تناسخ پر اُن اعتراضات کے علاوہ جنکا ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ دوسرا اعتراض پیش کرتا ہوں کہ اگر روح کا مختلف جسموں میں جنم لینا اس کے اپنے ہی افعال کا نتیجہ ہے۔ تو کیا وجہ کہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا یا یاد نہیں رہتا۔ کہ وہ کن افعال کی سزا ہے۔ میں نے گزشتہ ہفتہ بھی یہ

سوال کیا تھا۔ اس کا جواب دو مخالف پہلوؤں میں دیا گیا۔ بعض نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جسمیں ہمارے پریزیڈنٹ صاحب بھی شامل ہیں۔ کہ ہاں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کن افعال کی سزا ہے۔ اور ایک یعنے لالہ ہرچرن داس صاحب نے یہ بیان کیا کہ معلوم تو نہیں ہوتا۔ مگر اسمیں ایک بھید ہے۔ غرض اول تو آپس میں ہی پھوٹ ہے کہ مخالف پہلوؤں پر بحث کی جاتی ہے۔ اور دوم یہ کہ جواب جو دئے گئے وہ ہرگز تسلی بخش نہیں تھے۔ یہ جواب کہ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔ اس طرح پر دیا گیا کہ دیکھو ہم جو یہاں بدفعلی کرتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ وغیرہ۔ تو اسکی سزا معاً پا لیتے ہیں۔ مگر واضح رہے کہ یہ تو ہمارے سوال کا جواب نہیں۔ ہمارا سوال تو یہ ہے کہ اب جو زندگی بسر کر رہے ہیں۔ گزشتہ جنم میں ہم نے کون سے عمل کئے جن کے باعث ہمیں اس حالت میں پیدا کیا گیا۔ دوسرا جواب اس طرح پر دیا گیا تھا کہ ہاں معلوم تو نہیں ہوتا۔ مگر معلوم ہونا ضروری نہیں۔ مثلاً ہمیں بخار ہو جاتا ہے تو گو یہ تو ہم جانتے ہیں کہ کوئی بے اعتدالی ضرور ہوئی ہوگی۔ مگر ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔ آہستہ آہستہ اسباب جمع ہوتے رہتے ہیں حتےٰ کہ بخار ہو جاتا ہے۔ مگر ذرا غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ مثال صادق نہیں آتی۔ اسمیں شک نہیں کہ نامعلوم طور پر اسباب جمع ہوتے رہتے ہیں۔ گو بعض حالتوں میں معلوم ہو جاتا ہے کہ اب بخار ہونیوالا ہے اور اسکا باعث یہ ہے۔ مگر تاہم جب بخار ہو جاتا ہے تو ہم معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسکی وجہ کیا ہے اللہ تعالےٰ نے اسباب جسم ہی میں رکھے ہوئے ہیں۔ جس سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ آیا وہ بخار خوراک کی بے اعتدالی سے پیدا ہوا ہے۔ یا کہیں زخم ہے اسکی شدت سے پس جب ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔ تو ہم اسکا علاج کرتے ہیں۔ اور چونکہ اللہ تعالےٰ نے علاج بھی رکھا ہوا ہے۔ بخار رفع ہو جاتا ہے۔ یہی حال دیگر کل امراض کا ہے۔ البتہ جب موت کا وقت آجاتا ہے۔ تو خواہ مرض کا باعث

معلوم بھی ہو جائے۔ مگر فائدہ نہیں ہوتا۔ غرض اس مثال سے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہماری زندگی گزشتہ افعال کا نتیجہ ہے تو اول ہمیں یہ محسوس ہونا چاہئے کہ واقعی ہم سزا بھگت رہے ہیں۔ اور دوئم ہمارے پاس ایسے ذرائع ہونے چاہئیں۔ جس سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کن اعمال کی سزا ہے۔ اور تیسرے ہمارے پاس علاج ہونا چاہئے جس سے اس سزا سے رہائی ہو جائے۔ مگر ظاہر ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اِن تینوں باتوں میں سے کوئی میسر نہیں۔ پس ہمارا سوال ویسے کا ویسا قائم رہا۔ یعنے یہ ایک ظلم ہے کہ سزا تو دیجائے۔ مگر یہ نہ بتایا جائے کہ کس جرم کی سزا ہے۔ جب تک یہ بتایا نہ جائے اور جرم قائم کر کے سزا نہ دیجائے۔ اصلاح کی کیونکر امید ہو سکتی ہے۔ ایسے خدا کی خدائی سے تو ہمارے انسانوں کی گورنمنٹ بہتر ہے۔ دیکھئے عدالتوں میں جب تک جرم ثابت نہ ہو سزا نہیں دی جاتی۔ اور پھر سزا دیتے وقت بتایا جاتا ہے کہ فلاں جرم کی سزا ہے اور عند العقل یہی طریق انصاف بھی ہے۔ یہ ہرگز معقول نہیں کہ سزا دیجائے۔ اور یہ جتایا نہ جائے کہ کس گناہ کی سزا ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ مثلاً موسم برسات میں جو مینڈک مچھلی اور دیگر کیڑے مکوڑے دفعۃً لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ کس خاص گناہ کی بدولت ہے جو اس موسم میں زیادہ ہونے لگ جاتا ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ دنیا بھری پڑی ہے۔ کون جانتا ہے۔ ممکن ہے کوئی گناہ خاص وقت میں زیادہ ہونے لگ جاتے ہوں۔ انکی خدمت میں عرض ہے کہ آج کل تو کوئی ایسی بات نہیں جو چھپی رہے۔ ہر مضمون کی کتابیں چھپتی ہیں۔ ہر ملک اور ہر ملت میں ساری خبر رکھی جاتی ہے۔ یہاں بھی سالانہ رپورٹیں مجرموں کی اور اقسام جرم کی تیار ہوتی ہیں۔ پس خیالی جواب کوئی دلیل

یا تردید نہیں ہو سکتا۔

میں نے سوال کیا تھا کہ انسانوں کی آبادی جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ یہ روحیں کہاں سے آتی جاتی ہیں۔ اسکا جواب یہ دیا گیا کہ آبادی بڑھتی نہیں بلکہ اتنی ہی رہتی ہے۔ اور جب انسان زیادہ ہو جاتے ہیں تو کوئی وبا آکر صفائی کرنی شروع کر دیتی ہے۔ مگر اس پر ایک اعتراض لاحق ہو گیا۔ یہ تو ایک ظلم ہوا کہ صرف اس وجہ سے کہ انسان زیادہ ہو گئے ہیں انکو مار کر حیوان بنایا جاتا ہے۔ علاوہ اِس کے یہ کون سی دلیل ہے کہ ایک بدیہی بات کو محض assertion یعنے کہہ دینے سے رد کیا جاتا ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کر دی تھی کہ مردم شماری کی رپوٹیں دیکھئے جو ہر ملک میں چھپتی ہیں اور یہاں بھی مل سکتی ہیں۔ اِن سب سے عیاں ہے کہ آبادی بڑھ رہی ہے۔

میں نے تشریح کے بیان کیا تھا کہ تناسخ کو مانکر فضل ربانی کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ اُس کے جواب میں ماسٹر آتما رام صاحب نے ایک مثال دیکر سمجھایا کہ معاف کر دینا ظلم ہے۔ مگر جیسا میں نے بیان کیا ہے۔ معافی شرطوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ جو شخص دانستہ قانون کی خلاف ورزی کرے اُسے بھی معاف کر دیا جائے۔ بلکہ قصور جب جہالت اور سہو کی بنا پر ہو تبھی قابل عفو ہو سکتا ہے۔ یہ explanation سیدھا سادہ اور عین معقول اور نیچر یعنے فطرت کے مطابق ہے۔

میں نے قانون تدریج کی بنیاد پر ایک سوال کیا تھا جسکا جواب گزشتہ ہفتہ میں دو طرح پر دیا گیا۔ ایک تو یہ کہ تحقیقات سائنس غلط ہے۔ کیونکہ اس سائنس کے اصول سے انسان کی دم بہت لمبی ہونی چاہئے تھی۔ یہ خوب جواب ہوا کہ ایک ہی لفظ میں ساری تحقیقات کا ستیاناس کر دیا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ انسان کی نشست برخاست ایسی ہے کہ اُس میں

دم نشو و نما نہیں پا سکتی اور پھر یہ کہ ظاہرا انسان دنیوی پیدائش کی Superlation degree ہے پس صرف کہہ دینے سے ایک مسئلہ باطل نہیں ہو سکتا - دوسرا جواب یہ دیا گیا تھا کہ یہ تو چکر ہے - پس جیسے دائرے میں کوئی نقطہ آغاز ہی قائم نہیں کر سکتے - اسی طرح ہم نہیں کہہ سکتے کہ انسان پہلے تھا یا حیوان - مگر آپ مانتے ہیں کہ ایک وقت آئیگا کہ سب انسان مکتی پا جائیں گے یعنے تناسخ میں نہیں رہیں گے - مگر اس کے بعد پھر وہ دنیا میں لائے جائیں گے - اب ظاہر ہے کہ اُسوقت وہ سب انسان ہی ہوں گے - لہذا ثابت ہوا کہ ایک وقت ماننا پڑتا ہے کہ انسان ہی انسان ہوں اور نباتات اور حیوانات جو انسان کی موت کے بعد پیدا ہوتے ہیں - بالکل نہ ہوں - اب اس میں دو صورتیں قابل اعتراض پیدا ہوتی ہیں - ایک یہ کہ جب حیوان سبزی وغیرہ نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا - اور دوسرے یہ کہ اگر ساتھ ہی ان انسانوں کی روحوں میں سے حیوانات اور نباتات بھی پیدا کر دئے جائیں تو ظلم ہے کہ بلا قصور انکو سزا دی گئی -

تناسخ کی رو سے نعمت دنیا کو تیاگ دینا اور بنی نوع انسان سے ہمدردی کرنا ناجائز بلکہ گناہ ہے - تیاگنے کا لفظ تو پیارا معلوم ہوتا ہے - غالباً اس کے یہ معنی ہیں کہ پرمیشر کے دھیان میں - اس کے عشق میں - لذات شہوانی کو ترک کر دیا جائے - مگر جب یہ اصول ہے کہ نیک اعمال سے دنیوی راحت مال و دولت کی ملتی ہے - تو اگر اسکو رد کیا جائے - تو اسپر دو قصور لازم آتے ہیں - ایک یہ کہ جس انعام کے واسطے نیک اعمال کئے جاتے ہیں - جب انعام ہی کو ترک کر دیا تو نیکی سے فائدہ کیا - دوسرا یہ کہ جب انعام کو چھوڑ دیا جو اپنے اعمال کی وجہ سے ہے تو یہ کفرانِ نعمت ہوا اور گناہ ہوا - ہمدردی بنی نوع انسان اس طرح ناجائز بلکہ قابل سزا ہے کہ مثلاً اگر ہم مفلس محتاج کو کچھ دیتے ہیں - تو اسکی غرض یہ ہے کہ اُسکی

تکلیف رفع ہوجائے۔ مگر جب معلوم ہو کہ یہ تکلیف اُسکی سزا ہے جو اُس کے اعمال سے پیدا ہوئی ہے۔ تو اُسکی حمایت کرنا اُس سزا کو رد کرنا ہے جو گناہ ہے۔ مثلاً ہمیں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کو اگر جرم کی پاداش میں قید کی سزا ہوئی ہے۔ تو جو شخص ایسے مجرم کو کسی قسم کی مدد دے۔ کھانا عمدہ یا کپڑے دے۔ تو وہ بھی مجرم گردانا جائیگا۔ کیونکہ اُس نے یہ کوشش کی ہے کہ اُس سزا کو جس سے غرض یہ ہے کہ اصلاح ہو اور اُس سزا کو بھگتنے کے بعد پھر وہ ایسے جرم کا مرتکب نہ ہو۔ عمداً روکنا چاہا ہے۔ ہمارے پریزیڈنٹ صاحب عدالت کی کارروائیوں سے خوب واقف ہیں۔ اور وہ میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

غرض نتیجہ یہ نکلا کہ

۱۔ المال والبنون زینت الحیاۃ الدنیا۔ یعنے انسان کا مال ودولت اور اولاد زینت دنیا ہے۔ انکو نیک یا بد اعمال کی جزا و سزا سے کچھ تعلق نہیں۔

۲۔ یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفسٍ واحدۃٍ وخلق منھا زوجھا وبثّ منھما رجالاً کثیرًا ونساء۔ الخ یعنے انسانی روح ایک ہی ہے جو جمادات اور نباتات اور دیگر حیوانات کی روح سے ممیز ہے۔ اور اسی روح سے مرد اور عورت کی کثرت ہوئی ہے اور ہو رہی ہے۔ روح امر رب سے ہے۔ لسیلونک عن الروح۔ قل الروح من امر ربی۔ روح باہر سے نہیں آتی بلکہ انسانی نطفہ میں موجود ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جبتک ایک شے مرے دوسرا پیدا نہ ہو۔ ہندوستان میں ایک جوگیوں کا فرقہ دودھ دھاری ہے۔ انکے نطفہ میں بھی روح ہے۔ تناسخ کے ماننے والے اس امر کا ثبوت لے سکتے ہیں

۳۔ لقد خلقکم اطوارا۔ اُسی نے جس کے قبضہ قدرت میں کل کائنات کا کارخانہ ہے۔ یہ مختلف شکلیں بنائی ہیں۔ یہ کسی گزشتہ اعمال کا نتیجہ نہیں۔

۴۔ فخلق کل شیءٍ فقدرہٗ تقدیرا۔ اُسی نے ہر ایک کو اس کے مناسب
حال ایک اندازہ پر رکھا ہوا ہے۔ اور اُسی کے مناسب حال اس سے مواخذہ ہوگا اگر سب
ایک ہی حالت میں ہوں۔ تو دنیا کا کارخانہ بگڑ جائے۔ اور ایک فساد اور بغاوت کی حالت
پیدا ہو جائے۔

۵۔ فاطر۔ الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء۔ فاخرجنا بہ ثمرات مختلفاً الوانہا
ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانہا وغرابیب سود۔ ومن
الناس والدواب والانعام مختلف الوانہ کذالک۔ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء
ان اللہ عزیز غفور۔ یعنے اللہ تعالے نے آسمان سے بارش نازل کی اور اُس نے
مختلف رنگ کے پھل پیدا ہوئے۔ اور پہاڑوں میں طبقات سفید ہیں اور سخت سیاہ
ہیں۔ اور انسانوں اور چوپاؤں حیوانوں میں مختلف رنگ رکھتے ہیں۔ اسی طرح سب کا
اختلاف ایک ہی قانون کے ماتحت ہے۔ ع ہر کہ عارف تر است ترساں تر۔ اللہ تعالے بڑا غفور ہے

۶۔ نحن قسمنا بینہم معیشتہم فی الحیاۃ الدنیا ورفعنا بعضہم فوق بعض درجات
لیتخذ بعضہم بعضاً سخریا۔ الخ اللہ تعالے فرماتا ہے کہ ”ہم نے ہی حیات دنیا میں ان
میں ان کی روزی تقسیم کر دی ہے اور ایک کو دوسرے پر درجات میں فضیلت دی ہے جس سے
مدعا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے کام آئیں“۔

۷۔ یا ایہا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون
الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناءً وانزل من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرات رزقاً
لکم۔ فلا تجعلوا للہ انداداً وانتم تعلمون۔ اے لوگو اس رب پروردگار کی بندگی کرو
جس نے تمہیں اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بنو۔ وہی جس نے تمہارے واسطے زمین کو

آسمان کو اوڑھنا بچھونا بنا دیا اور آسمان سے پانی اُتار کر تمہارے واسطے میوہ جات رزق نکالدیا
پس تمہیں چاہئے کہ اِس کے ساتھ کسی چیز کو برابری کا درجہ مت دو۔ اتنی تو تمہیں عقل ہے۔

۸- اللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنفُسَ حِینَ مَوتِہَا وَالَّتِی لَمْ تَمُتْ فِی مَنَامِہَا فَیُمْسِکُ الَّتِی قَضٰی عَلَیہَا الْمَوتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَومٍ یَّتَفَکَّرُونَ

یعنے اللہ تعالےٰ جانوں کو انکی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مرا اسکو نیند کی حالت میں۔ پس اسکو بند رکھتا ہے جس پر موت وارد ہو جائے اور دوسرے کو وقت معینہ تک بھیجدیتا ہے (جو مر جاے اسکو اللہ تعالےٰ دوبارہ دنیا میں نہیں بھیجتا بلکہ دوسرے آتے ہیں) اسمیں غور و فکر کرنے والی قوم کے واسطے نشانات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علےٰ رسولہ الکریم

حاضرین جلسہ۔ گزشتہ ہفتہ میں نے یہ ظاہر کرنیکی کوشش کی تھی کہ انسان کا مختلف
شکل کا ہونا عین قانون نیچر کے مطابق ہے۔ اور امیری اور غریبی تمدنی تفرقہ ہے جسکو گزشتہ
زندگی کے اعمال سے مطلق تعلق نہیں۔ میں نے مختصر تشریح کے ساتھ ثابت کیا تھا کہ جیسے
اور کائنات میں محض مادّے سے شروع ہو کر زمین کے مختلف حصوں کی باطنی تاثیر اور
وہاں کی آب و ہوا کی ظاہری تاثیر سے اسکی ہیئت بدل جاتی ہے۔ اسی طرح درخت
اور پودے اور حیوانات مختلف قطع وضع اور رنگت کے ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر گویا
انسان بھی مختلف قطع وضع اور رنگت کے ہوتے ہیں۔ مثلاً انسان کی بنیاد نطفہ سے
شروع ہوتی ہے۔ نطفہ انسان کا بیج یا تخم ہے۔ اس نطفہ میں تاثیر ہوتی ہے۔ خوراک کی
مرد کی خواہشات اور لذات کی۔ اور عقل و فہم کی۔ اس کے بعد وہ رحم مادر میں جا کر ٹھیرتا ہے۔

وہاں بھی موثر ہوتا ہے۔ عورت کی خوراک۔ جذبات اور فہم و ادراک سے۔ اور دیگر مخفی اسباب
ہوتے ہیں۔ جنکی وجہ سے یا وہ صحیح العضو پیدا ہوتا ہے۔ یا اس کے اعضا میں فرق آجاتا
ہے اور وہ اندھا۔ کانا۔ لنگڑا۔ لولا۔ پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ رحم مادر سے باہر آتا ہے۔ تو خارجی
اسباب اُس پر اثر کرتے ہیں۔ اور اس کا جسم انہی اسباب کے مطابق تغیر کرتا رہتا ہے۔ غرض
جب وہ بلوغت کو پہنچتا ہے۔ تو خود زندگی کے اسباب پیدا کرنیکی کوشش میں لگتا ہے
تو چونکہ فہیم ہستی ہے۔ اور گو اپنی تقدیر کے دائرہ میں ہی سہی فعل مختار ہے۔ بسا اوقات
ایسا ہوتا ہے کہ وہ دنیاوی تفرقہ کے لحاظ سے غریبی کی حالت میں رہتا ہے۔ مگر بسا اوقات ایسا
ہوتا ہے کہ وہ امیر ہو جاتا ہے۔ بہت سے انسان غریب ماں باپ کے گھر میں پیدا ہو کر اپنی کوشش
سے سوسائٹی کے اعلےٰ درجہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور متمول ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سے
ایسے ہیں جو امیروں کے گھر میں پیدا ہو کر خود جب دنیاوی حالت میں آتے ہیں تو مفلس
ہو جاتے ہیں۔ اگر تناسخ کو مانا جاوے۔ تو ایسی حالت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مثلاً ایک
شخص غریب گھر میں پیدا ہوا ہے تو گویا یہ اُس کے بُرے کرموں کی سزا ہے تو پھر وہ
بلوغت میں پہنچ کر جبکہ سزا اُس پر قائم رہنی چاہئیے کیونکہ اُس سے پہلے تو اُس نے کافی طور
پر ہوش نہیں سنبھالا تھا۔ وہ متمول کیوں ہو جاتا ہے۔ یا برعکس اس کے اگر وہ امیر گھر میں
پیدا ہوا ہے۔ جہاں سب عیش و عشرت کے سامان مہیا ہیں۔ تو یہ گویا اُس کے گزشتہ
زندگی کے نیک اعمال کا نتیجہ ہے۔ یہ نتیجہ اُس کو اس وقت تک قائم رہنا چاہئیے جس
حالت میں اُس نے نیک اعمال کئے۔ یعنے جوانی کی حالت میں یا بڑی عمر کی حالت میں
مگر اُس حالت میں پہنچ کر وہ غریب ہو جاتا ہے۔ پس جب وہ جزا و سزا قائم نہیں رہتی تو معلوم
ہوا کہ مسئلہ تناسخ باطل ہے۔ غرض اسی طرح میں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی

کہ سوشل تفرقہ یعنے امیری و غریبی گزشتہ اعمال کا نتیجہ نہیں تجربہ سے ثابت ہے، اور ماسٹر ہرجرن داس صاحب نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جو معلومات دنیا میں موجود ہوتی ہیں۔ اس پر انسان ترقی کرتا ہے۔ انسان کی ابتدائی حالت دنیا میں افریقہ کی بعض قوموں سے ظاہر ہے۔ اور یہ بات کہ موجودہ معلومات سے انسان چونکہ فہیم ہستی ہے اور اُس کے ساتھ ہی فعل مختار۔ ترقی کس طرح کر لیتا ہے۔ جاپان کی گزشتہ پندرہ بیس سال کی تاریخ سے بداہت کھُل جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جاپانیوں نے یورپ میں جاکر موجودہ علوم سیکھے۔ انکو اپنے ملک میں رواج دیا اور ترقی کر گئے۔ اس قلیل عرصہ میں جو ایک انسانی زندگی سے بہت کم ہے اُن کا اس طرح ترقی کر جانا دلیل ہے اس بات پر کہ وہ ماں کے پیٹ سے تعلیم پاکر نہیں نکلے تھے۔

الغرض میں نے مادّہ کی اور پھر نباتات اور حیوانات کی اور عام قانون قدرت کی مثالیں دیکر سمجھا دیا تھا کہ کس طرح انسان اندرونی اور بیرونی اسباب کی تاثیرات سے مختلف قطع وضع اور رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ بات ہمارے دوستوں نے بخوبی سمجھ لی ہے کہ واقعی یہی اسباب انسان کی شکل میں فرق ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس نتیجہ پر اعتراض نہیں کیا۔ البتہ ماسٹر ہرجرن داس صاحب کی تقریر سے معلوم ہوا کہ انہیں ابھی یہ تسلّی نہیں ہوئی کہ ظاہری بناوٹ انسان کی ذہانت یا برخلاف اس کے غبی وغیرہ ہونے سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ سو آج میں بیان کر دیتا ہوں کہ انسان کا ذکی فہیم عقلمند بیوقوف ہونا اُسکی جسمانی بناوٹ پر منحصر ہے۔

ایک علم قیافہ ہے جسے انگریزی میں Physiognomy کہتے ہیں۔ اس علم کے ذریعہ انسان کے جسم کی بناوٹ اور اس کے خط و خال سے پہچان لیا جاتا ہے

کہ وہ ذہین ہے۔ غبی ہے۔ دلیر ہے۔ ڈرپوک ہے وغیرہ وغیرہ۔ قیافہ شناس اس علم کو
دو حصوں⊗ پر تقسیم کرتے ہیں National Physiognomy
یعنے قومی قیافہ اور Individual physiognomy یعنے
شخصی قیافہ۔ قومی قیافہ میں اہل دنیا چار شاخوں پر منقسم ہے Races of whites
(سفید رنگ کے باشندے) Negroes (حبشی) مغل اور اہل ہند۔ ان
چار شاخوں کے خط و خال میں فرق ہے۔ پھر اس کے بعد سرزمین کے مختلف حصوں
کے باشندوں کو دیکھتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر ملک کی آب و ہوا سے ان کے باشندوں
کے قد و قامت۔ خط و خال۔ ایک خاص قسم کے ہیں اور ایک دوسرے سے علیحدہ۔ مثلاً
کینیڈا کے باشندے دراز قد اور مضبوط ہوتے ہیں مغل ترک جنھوں نے چین کو فتح کیا تھا
چھوٹی آنکھیں رکھتے ہیں۔ ان کے چہرے بڑے بڑے اور چوڑے ہوتے ہیں۔
ڈاڑھی کے بال بہت تھوڑے اور ناک چھوٹی۔ جارجیا اور کشمیر کے خوبصورت ہوتے ہیں
لکھا ہے کہ کشمیر کے باشندوں کے چہروں میں ذاتی ذہانت کے آثار ہیں۔ اگر انہیں
تعلیم ملے تو علم اور ہنر میں بڑی ترقی کر سکتے ہیں۔ ترکوں میں لنگڑے لولے شاذ ہی ملتے
ہیں۔ ہسپانیہ والوں کے خط و خال باقاعدہ عمدہ آنکھیں۔ باترتیب دانت۔ رنگت
سیاہی نما ہوتے ہیں۔ حبشیوں میں سنی گال کے باشندے خوش بناوٹ کے ہوتے
ہیں۔ اور تعلیم جلدی حاصل کر سکتے ہیں۔ غرض ہم ہندوستان میں دیکھئے۔ آپ جھٹ
کہدیتے ہیں کہ یہ بلوچ ہے یا افغان ہے یا برمی ہے یا بنگالی ہے گو ان کے
لباس میں فرق ہے۔ مگر ان کے Features (خط و خال) بھی مختلف ہیں

⊗ Sir Lavaters Physiognomy

جو ملک کے مختلف حصوں کی آب و ہوا کا نتیجہ ہے - یہ قومی قیافہ ہے -

اب میں واضح طور پر بیان کر دیتا ہوں کہ ہر انسان کی ذہانت وغیرہ اسکی بناوٹ پر منحصر ہے - اول پیشانی کو لیجیے - جس شخص کی پیشانی ماتھے کے بالوں سے بھوں تک سیدھی یعنے Perpendicular ہو اسمیں فہم کا مادہ بہت کم ہوتا ہے - سیدھی پیشانی جو سر کے بالوں کے پاس آکر ذرا جھکی ہوئی ہو - قوت خیال کو ظاہر کرتی ہے پیشانی جو آگے کو جُھکی ہوئی ہو یا بیٹھی ہوئی ہو بیوقوفی پر دلالت کرتی ہے - چنانچہ پنجاب میں ایک فرقہ درویشوں کا پھرا کرتا ہے جنکو شاہ دولہ کے چوہے کہتے ہیں - انکی پیشانی بالکل پست ہوتی ہے - لہذا انمیں فہم اور ادراک کا مادہ بہت ہی کم ہوتا ہے - یہ بات یوں بھی آزما ہو جاتی ہے - مثلاً ایک بچہ پیدا ہوا ہے - اُسوقت اسکا جسم نرم اور لچکدار ہوتا ہے - پس اگر آہستہ آہستہ کچھ عرصہ تک اُسکی پیشانی کو دبایا جائے - وہ بیٹھ جائے گی - پھر خواہ اُس نے پہلی زندگی میں کتنا علم پڑہا ہو اور اوکسفورڈ یونیورسٹی کا ایم اے پاس کیا ہو - مگر اب وہ ابتدائی لوئر پرائمری کی کتابوں پر بھی حاوی نہیں ہو سکے گا - تناسخ کے ماننے والے یہ تجربہ کر کے دیکھ لیں - غرض بڑی پیشانی جو پیچھے کو جھکی ہوئی ہو - اُسمیں خیالی قوت اور مجھ سمجھ بہت زیادہ ہوتی ہے

کھلی آنکھ جو دلی ہوئی نہ ہو اور جو ناک کے ساتھ لمبا acute زاویہ بنائے تیز فہم لوگوں کی ہوتی ہے - ایسی آنکھ جسکی پتلی کے اوپر پلکوں کی Horizontal line بنے - بڑے لائق تہ تک پہنچنے والے آدمیوں کی ہوتی ہے -

ایسے ہی بھوں جو گول زاویہ کی شکل میں ہوں اور ایک دوسرے سے بعید ہوں - غصہ اور حستی کو ظاہر کرتے ہیں - اور اگر بھوں آنکھ کے نزدیک ہوں مستقل مزاجی بتاتے ہیں

اور اگر آنکھوں سے فاصلہ پر ہوں۔ اِس امر کی دلیل ہی کہ وہ جلد نرم ہو جانیوالی طبیعت کے اور اسمیں جرأت نہیں اسی طرح ناک جو نوکدار ہو یا چوڑی پشت والا ہو۔ حد درجہ کی ذہانت ظاہر کرتا ہے لکھا ہے کہ بہت چوڑی پشت والی ناک غیر معمولی لیاقت کے آدمیوں میں ہوتی ہیں جو دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔

غرض اسی طرح ہونٹوں دانتوں اور تھوڑی کا حال ہے۔ اور جسم کے دیگر حصے بھی خاص خاص صفتیں ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً نسبتاً چوڑی چھاتی طاقتور آدمی کی ہوتی ہے۔ لمبے ناخن قدرے بے حیائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ موٹے اور گھنگر بالے پیچیدہ سر کے بال والے میں غصہ بہت ہوتا ہے۔

میں اِس مضمون کے متعلق بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مگر وقت تھوڑا ہے۔ علاوہ اس کے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ جسم کی بناوٹ پر فہم و ادراک یا غبی وغیرہ ہونا منحصر ہے جو مختصر الفاظ میں بیان کر دیا گیا۔ پس جب یہ ثابت ہے کہ انسان کا دیگر افراد جمادات اور نباتات کی مانند مختلف قطع وضع کا ہو جانا عین قانون نیچر کے مطابق ہے۔ تو ساتھ ہی یہ ماننا پڑا کہ کسی کا حد درجہ ذہین وغیرہ ہونا۔ ہرگز اس امر کی دلیل نہیں کہ اس نے پہلے بھی کوئی تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ باتیں کہ فلاں شخص نے چھوٹی عمر میں اقلیدس کی شکلیں حل کر دیں اور حساب کے ادق سوالات کو سمجھ لیا۔ یہ اُس کی ذاتی ذہانت کو جو بناوٹ جسم کے مطابق ہے ظاہر کرتے ہیں نہ کچھ اور۔ البتہ زبان دانی کو ذاتی ذہانت سے کچھ تعلق نہیں۔ اگر مسئلہ تناسخ صحیح ہے تو جیسا آپ مانتے ہیں کہ انسان انسانی شکل میں آ گزشتہ تعلیم پر جو اُس نے حاصل کی ہوئی ہوتی ہے۔ ترقی کرتا ہے۔ اسی طرح چاہیے تھا کہ بعض شخص ماں کے پیٹ سے ہی سنسکرت یا انگریزی پڑھے ہوئے نکلتے۔ مگر میں دعوے سے کہتا ہوں کہ آپ ایک بھی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ پس ثابت ہوا کہ مسئلہ تناسخ غلط ہے

ضمیمہ

جیسا کہ میں انٹروڈکشن میں ظاہر کرچکا ہوں میں نے مناسب خیال کیا ہے کہ ماسٹر آتمارام صاحب کے ان چار سوالات کے جوابات کو بطور ضمیمہ رسالہ ہذا میں شامل کردیا جائے جنکا جواب میں نے عمداً اس واسطے چھوڑ دیا تھا کہ وہ مضمون زیر بحث کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے تھے چنانچہ میں سوالات کو یکے بعد دیگرے لیتا ہوں۔

اوّل۔ بہشتی اور دوزخی زندگی

اعتراض یہ ہے کہ "انسان کے محدود اعمال کے لئے ابدی یعنے غیر محدود جزا اور سزا کا ہونا درست نہیں۔

جواب۔ بے شک انسان کی بنیاد ضعف پر ہے (خلق الانسان ضعیفا) اور اس لئے وہ رحم کا مستحق ہے۔ اور اس لائق ہے کہ اسکی بعض کمزوریوں سے چشم پوشی کیجائے۔ مگر یہ اعتراض اسلامی تعلیم پر وارد نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ قرآن مجید ہرگز جائز قرار نہیں دیتا کہ انسان کو تھوڑے عرصہ کی بداعمالیوں کے باعث ہمیشہ دوزخ میں رکھا جائے۔ معترضین نے محض ابد کے لفظ سے یہ دھوکا کھایا ہے کہ راحت اور خوشی کی حالت ایسی دائمی ہوگی جسکا کوئی انتہا نہیں ہوگا۔ اصل میں ہر لفظ کے معنے اس حالت کے مطابق ہوتے ہیں جہاں وہ استعمال کیا گیا ہے اگر ہم کسی انسان کے متعلق کہیں کہ وہ ہمیشہ فلاں کام میں مصروف رہیگا۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابدالاباد تک وہ وہی کام کرتا رہیگا۔ بلکہ ہمیشہ کے لفظ میں اسکی زندگی کا زمانہ مفہوم ہوگا اسی طرح بہشت اور دوزخ کے متعلق جو ابد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تو اس میں ان کے

زمانہ قیام کا مفہوم شامل ہے۔ قرآن شریف نے دوزخ کے زمانہ ابد کو احقاباً سے تعبیر کیا ہے اور بہشت کے زمانہ ابد کو عطاءً غیر مجذوذ اور اجرًا غیر ممنون سے۔ چنانچہ وہ آیات جن میں یہ الفاظ آئے ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اِنَّ جَہَنَّمَ کَانَتْ مِرْصَادًا۔ لِلطّٰغِیْنَ مَاٰبًا۔ لٰبِثِیْنَ فِیْہَا اَحْقَابًا۔ پارہ ۳۰۔ سورہ نبا
تحقیق دوزخ گھات میں ہے۔ سرکشوں کے لئے وہ جگہ ہے بازگشت کی۔ اس میں مدت تک رہیں گے۔

۲۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَہُمْ فِیْہَا زَفِیْرٌ وَّشَہِیْقٌ۔ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ ط اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ ط عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ۔ پارہ ۱۲۔ سورہ ہود۔ پس جو لوگ بدبخت ہوئے۔ پس بیچ آگ کے ہیں۔ ان کے واسطے اس میں رونا اور چلانا ہوگا۔ اسمیں وہ لوگ رہیں گے جب تک زمین و آسمان رہیں گے۔ مگر جو چاہے تیرا رب تحقیق تیرا رب کرنیوالا ہے جو ارادہ کرتا ہے ٭ اور سعید لوگ جنت میں رہیں گے جب تک زمین و آسمان رہیں گے۔ مگر جو چاہے تیرا رب بخشش ہے نہ کاٹی گئی۔

۳۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَہُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ۔ پارہ ۳۰۔ سورہ التین ٭
ہم نے انسان کو اچھی ترکیب میں پیدا کیا ہے۔ پھر ہم اسکو نیچے درجہ میں گرا دیتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں اور عمل نیک کریں۔ پس ان کے واسطے اجر ہے جسکی انتہا نہیں

قرآن شریف نے جہنمی حالت کو کہیں بے انتہا نہیں فرمایا۔ برخلاف اس کے بہشتی زندگی ایسی بیان کی ہے جو منقطع نہیں ہوتی۔ اسمیں شک کی گنجائش نہیں۔ تاہم حدیث شریف

نے جو میں پیشتر نقل کر چکا ہوں۔ اِس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ روحانی ترقی کی کوئی حد نہیں۔ چنانچہ بہشتی حالت کے مدارج ہیں اور روح اُسمیں برابر ترقی کرتی رہے گی۔ جیسا کہ بعض مقامات قرآن شریف سے ظاہر ہے۔

شفاعت

اعتراض ہے کہ شفاعت معقول نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ معترضین نے شفاعت کے یہ معنے سمجھے ہیں کہ انسان خواہ نیک ہو یا بد۔ خواہ اس نے کبھی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگہداشت کی ہو یا نہ کی ہو اور خواہ وہ عمر بھر فسق و فجور میں غرق رہا ہو۔ وہ محض سفارش کرنے سے بخشا جائیگا اور جنت میں جگہ پائیگا۔ مگر یہ معنے غلط ہیں اور قرآن اور حدیث سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی۔ شفاعت لفظ شفع سے مشتق ہے۔ جس کے معنے ہیں ملنے کے اور اسی میں اسکی حقیقت مخفی ہے۔ یعنے شفاعت کا وہ مستحق ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیوند پیدا کیا ہو۔ اور انکی تعلیم اور سنت کا پابند رہا ہو۔ ورنہ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ۔ پارہ ۲۴ سورہ المومن۔ ظالموں کے واسطے کوئی دوست اور شفیع نہیں جسکا کہا مانا جائے۔ اور سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ پارہ ۲۸۔ سورہ المنٰفقون۔ ان پر مساوی ہے کہ تو ان کے واسطے بخشش مانگے یا نہ۔ اللہ انکو نہیں بخشے گا۔ کیونکہ اللہ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

ان آیات سے واضح طور پر ظاہر ہے کہ خواہ کوئی ہو ہندو ہو یا مسلمان اگر وہ اللہ اور رسول کے احکام کی پروا نہیں کرتا۔ اس کے واسطے کوئی شفاعت فائدہ نہیں دے سکتی۔ سفارش اور شفاعت میں فرق ہے۔ جیسا ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص ایسے آدمی کی سفارش نہیں کرتا جس سے اسکو کوئی تعلق اور واسطہ نہو۔ اور جس قدر کسی کے ساتھ اسکا تعلق الفت اور محبت کا ہوگا۔ اسی قدر

اسکی سفارش کریگا۔ تو کیونکر ہوسکتا ہے کہ حضرت نبی کریم سب کی بلالحاظ ایمان اور افعال یکساں شفاعت کریں گے۔ خُلق الانسان ضعیفا۔ پس ناممکن ہے کہ انسان ایسا ہوجائے کہ کلھم بخشش کا مستحق ہوجائے۔ انسان کا فرض ہے کہ سعی کرے۔ اللہ تعالےٰ اسکو اپنے فضل سے دستگیری کرتا ہے اور اپنی رحمت میں جگہ دیتا ہے۔ شفاعت علےٰ قدر مراتب ہوگی۔ جسقدر کسی کا گہرا تعلق حضور سرور کائنات سے ہوگا اُسی قدر وہ فائدہ اُٹھائیگا۔ اور بہت ایسے ہونگے جنکے واسطے کوئی شفاعت نہیں ہوگی چنانچہ احادیث اس مضمون سے بھری پڑی ہیں البتہ انسان ضعیف ہے بشری کمزوریوں کے سبب لغزش کر بیٹھتا ہے پس عدل اور رحم چاہتا ہے کہ اُس سے درگزر کی جائے اور شفاعت پر اسکو بخشش ہو۔

رحم اور عدل

کہا جاتا ہے کہ رحم اور عدل جمع نہیں ہوسکتے۔ حالانکہ عدل چاہتا ہے کہ بعض موقعوں پر رحم سے کام لیا جائے۔ افسوس ہے کہ اعتراض کرنے والے غور وفکر نہیں کرتے اور اندھادھند اعتراض کیے جاتے ہیں۔ مشاہدہ اور تجربہ کرتے ہیں کہ دنیا میں جگہ جگہ رحم اور عدل ہوتا ہے مگر اعتراض کرتے وقت اُس سے چشم پوشی کرلیتے ہیں۔ انسان اور انسانی گورنمنٹ یہاں تک رحم کی رعایت رکھتی ہے کہ اگر کوئی نادانستہ خون کردے تو اُسے معاف کردیتی ہے۔ کیا عدل نہیں چاہتا کہ اُس شخص پر رحم کیا جائے جس نے عمداً قصور نہیں کیا۔ بے شک چاہتا ہے اور آئے دن اکثر قصور معاف کرتے رہتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اگر عدل کے ساتھ کسی پر رحم کرے یا کرنیکا وعدہ کرے تو اُسکو غلط سمجھا جاتا ہے اور اُسپر نکتہ چینی ہوتی ہے۔ اصل میں انسان کمزور ہستی ہے۔ وہ عالم الغیب نہیں۔ اُس کی

کل طاقتیں اندرونی اور بیرونی محدود ہیں اور لہذا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ غلطی اور جہالت سے
اور بھول سے ایک فعل کر بیٹھتا ہے جو اُسکو کرنا نہیں چاہئے۔ ایسی حالت میں اُسپر رحم نہ کرنا
عدل کے خلاف ہے اور ظلم ہے۔ عدل رحم کے منافی نہیں عدل ہی کا تقاضا ہے کہ اُسپر
رحم کیا جائے اور اُسکو معافی دی جائے اگر رحم نہ کیا جائے تو عدل کا خون ہوتا ہے۔ رحم کے یہ معنے ہرگز نہیں
کہ اگر ایک شخص عمداً بار بار ایک جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اُسکو رہا کر دیا جائے اور نہ ہی عدل کا
یہ مفہوم ہے کہ انسانی کمزوری کے سبب کسی سے لغزش ہو جائے تو اُسکو ایسی سزا دی جائے جیسی
اُس شخص کو جو عمداً جرم کو جرم سمجھ کر اُس سے باز نہیں رہتا۔ ہر صفت کو موقعہ اور محل دیکھ کر مناسب
طور پر استعمال کرنا چاہئے یہی انسانیت ہے۔ اور یہی صحیح طور پر خلق ہے۔

عیسائیوں نے بھی رحم اور عدل الہی کے سمجھنے میں عجیب غلطی کھائی ہے۔ کہا جاتا ہے
کہ اللہ تعالے کا رحم چاہتا تھا کہ انسانوں کے گناہوں کو معاف کیا جائے۔ کیونکہ وہ ہمہ تن محبت
ہے اور محبت کا تقاضا ہے کہ رحم کرے مگر رحم کرنا عدل کے خلاف تھا۔ عدل چاہتا تھا کہ انکو انکے
گناہ کے عوض میں سزا دیجائے۔ اور یہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ عدل کو چھوڑ دے ایسی مجبوری
میں اُس نے اپنا اکلوتا لڑکا دنیا میں بھیجکر اُسکو دنیا کے گناہ کی سزا کے عوض میں سولی دیدیا
اور اس طرح رحم اور عدل کی صفت کو پورا کر دیا۔ مگر یہ نہ سوچا کہ حقیقت میں نہ رحم ہوا اور نہ عدل
بلکہ ظلم ہو گیا۔ اول تو جس غرض کے لئے یہ تجویز کی گئی تھی وہ غرض پوری نہ ہوئی۔ مدعا یہ تھا کہ لوگ
گناہ کی سزا سے بچ جائیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کیا عیسائی اور کیا دوسری قومیں جب جرم کی مرتکب
ہوتی ہیں تو سزا پاتی ہیں۔ پس جب گناہ کی سزا سے معافی نہیں ملی تو یوم آخرت کے لئے
کوئی ثبوت نہیں کہ ان سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ دوئم بیٹے کا کوئی قصور نہیں تھا۔
عدل چاہتا تھا کہ اس پر تشدد نہ ہو۔ مگر سولی دیکر بجائے عدل کے ظلم کر دیا اور رحم کی صفت بھی

پوری نہ ہوگی۔

غرض انسان جب اپنی طرف سے قیاسات اور خواہشات کی پیروی کرتا ہے تو طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قرآن شریف کلام الٰہی ہے جب وہ خود قدوس ہے تو اوسکی کلام بھی قدوس ہے۔ پس قدوس کلام کے سمجھنے کے لئے قدوس دل اور قدوس عقل چاہیے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اسکے کلام کے سمجھنے کے لئے محض عربی زبان اور مادی عقل کافی نہیں۔ بلکہ اس کے واسطے چاہیے (۱) پاک باطن ہو۔ لایمسہ الا المطہرون (۲) قلب سلیم رکھتا ہو۔ اور (۳) صاحب لب ہو یعنے باریک فہم رکھتا ہو۔ انما یتذکر الا اولوا الالباب۔ چونکہ مخالفین میں ان تینوں صفتوں میں سے کوئی نہیں بلکہ برخلاف اس کے ضد اور تعصب ہے۔ اس لئے وہ فہم قرآن سے قاصر رہتے ہیں اور اعتراض کرتے رہتے ہیں۔

عفو گناہ

ایک اعتراض یہ ہے کہ گناہ معاف نہیں ہو سکتا اور توبہ عبث ہے۔ یہ اعتراض بھی جہالت اور قرآن شریف کی تعلیم صحیح طور پر نہ سمجھنے کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ توبہ کے معنے ہیں پھرنے کے۔ پس توبہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان بدی سے باز رہکر نیکی کرے۔ توبہ سے معافی کس طرح ملتی ہے۔ اسکی فلاسفی اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ط اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ ط ذٰلِکَ ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ۔ پارہ ۱۲ سورہ ہود۔ یعنے نیکیاں بدیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ جس طرح سیاہی کے اوپر سفیدی کرنے سے سیاہی کم اور معدوم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نیکی کرنے سے پہلے بدی کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ بدی چھوڑ کر نیکی کرنا توبہ ہے۔ اور نیکی سے جو بدی کا اثر جاتا رہتا ہے یہ بخشش اور معافی ہے محض زبان سے توبہ کہنے سے توبہ نہیں ہو جاتی اور نہ مونہہ سے معافی مانگنے سے معافی

مل سکتی ہے۔ اس میں شک کہ بعض بدیاں بہت دیر سے زائل ہوتی ہیں اور بعض جلدی جسقدر
اہم بدی ہو اسی قدر اہم اس کے مقابلہ میں نیکی چاہئے۔ اور بعض ایسی ہیں کہ وہ زائل ہی نہیں
ہو سکتیں۔ اسکی مثالیں ہیں دنیا میں بھی کئی طرح ملتی ہیں۔ انسان بدی اور شرارت کرتا ہے
سزا پاتا ہے۔ مگر چال چلن درست کرنے اور اصلاح کرنے پر اُسکی سزا میں تخفیف کر دی جاتی
ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ پھر میں خاص نیکی کے کام کرے۔ گورنمنٹ
کو خاص طور پر مدد دے اور سوسائٹی میں فساد رفع کرنے کی کوشش کرے تو علاوہ معافی
کے اُسکو انعام ملتا ہے۔ اسی طرح انسان بے اعتدالی کرتا ہے بیمار ہو جاتا ہے مگر دوا
کرنے سے پھر شفا پاتا ہے۔ البتہ بعض جرم اور اس کے عوض میں بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ
نہ توبہ ہو سکتی ہے اور نہ معافی۔ مثلاً کثرت زنا اور شراب سے سوزاک ہو۔ آتشک ہو جذام ہو جاوے
(استغفر واللہ) قوائے مارے جائیں اور آلہ شہوت ہی نہ رہے۔ اُسوقت انسان توبہ
کرے۔ شراب نہ پیئے۔ زنا چھوڑ دے۔ یہ اسکی توبہ نہیں کیونکہ وہ اسوقت اس قابل ہی نہیں
رہا۔ کہ ان افعال کا مرتکب ہو بلکہ مجبوراً اُسکو ترک کرنا پڑا۔ اسی طرح ایک موقعہ ایسا ہو سکتا ہے
کہ انسان ساری عمر فسق و فجور میں مبتلا رہا۔ اخروقت جل آپہنچا اور اُسوقت توبہ کرلی۔ مگر اس توبہ
سے کوئی معافی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ یہ وہ وقت ہے کہ وہ توبہ سے بدی ترک کرکے اور اس کے
عوض نیکی اختیار کرکے معافی حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ
انسان توبہ کر ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ختم اللہ علے قلوبہم کا فتوے لگ جاتا ہے
اور اس سے توبہ کی توفیق چھین لی جاتی ہے۔ یہ قانون الٰہی ہے کہ جس غرض کے لیے کوئی
چیز پیدا کی گئی ہے اگر اس سے اُسکو ایک عرصہ تک باز رکھا جائے تو وہ طاقت اُس سے معدوم
ہو جاتی ہے۔ آنکھ کا کام ہے دیکھنا۔ اگر کچھ عرصہ تک اُسکو بند رکھا جائے تو بینائی جاتی رہے گی۔

اور پھر کوئی علاج اُسکو قائم نہیں کر سکتا۔ ہاتھ کو اگر ایک مدت تک بیکار رکھا جائے۔ وہ سوکھ جاتا ہے۔ مرجاتا ہے اور کوئی دوا اُسے زندہ نہیں کر سکتی۔ وہ بیکار ہو جاتا ہے۔ یہی حال دل کا ہے۔ اگر وہ ایک عرصہ تک نیکی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ کلام الٰہی کو نہیں سنتا۔ غور و فکر نہیں کرتا اُس سے نیکی کی توفیق چھن جاتی ہے۔ غرض توبہ کی مختلف کیفیتیں ہیں اور مختلف درجے ہیں اور قرآن شریف نے اُنکو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حیرانی ہے کہ آیات کے ہوتے ہوئے کس طرح اعتراض وارد کر دیے ہیں۔

(۱) + + + اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

پارہ ۳۔ ع ۱۶۔ رحم کے ساتھ بخشش اُسوقت ہے کہ انسان توبہ کے بعد اصلاح کرے۔

(۲) اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِكَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا + وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا + پارہ ۴۔ رکوع ۱۴ + اللہ تعالےٰ ان لوگوں کی توبہ منظور کرتا ہے جو جہالت سے بدی کرتے ہیں۔ پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ نہ کہ ان لوگوں کی جو عمر بھر بدی میں مشغول رہیں حتےٰ کہ موت آجائے اور اُسوقت پکار اُٹھیں کہ اب میں توبہ کرتا ہوں۔ اور نہ ہی ان لوگوں کی توبہ منظور ہوتی ہے جو کفر کی حالت میں مرجاتے ہیں۔

اصل میں دو طرح کے جرم ہیں۔ ایک وہ کہ اُس فعل میں ہی سزا مرکوز ہوتی ہے۔ اور خواہ انسان عمداً کرے یا غفلت سے۔ سزا اُس پر وارد ہو جاتی ہے۔ مثلاً زہر خواہ انسان کسی عالت میں کھائے وہ اپنا اثر کرے گی۔ اور اس کا اثر زائل کرنے کے واسطے بڑی جدوجہد کرنی پڑیگی اور دوم۔ وہ کہ دفعۃً سزا وارد نہیں ہوتی۔ اسمیں بہت سی باتیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی

داخل ہیں۔ اللہ تعالےٰ چاہے بخشے یا عتاب کرے۔ یہ دونو قسم کی سزائیں اس واسطے رکھی ہیں کہ انسان ترقی کرے

بعض گناہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے متعلق ہیں اور بعض اپنی ذات کے متعلق۔ جو گناہ اپنی ذات اور اللہ تعالےٰ کے متعلق ہیں۔ انکی بخشش پر چنداں اعتراض نہیں ہوتا۔ مگر اعتراض عموماً ان گناہوں کے متعلق ہوتا ہے۔ جو حقوق العباد سے علاقہ رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کسی کی بے عزتی کرتا ہے۔ اُسکا مال چورلیجاتا ہے۔ یا اسی طرح کوئی اور حق چھینتا ہے۔ اور اسکے بعد توبہ کرتا ہے۔ تو اس صورت میں مجرم کو تو معافی ہوگئی۔ مگر اُس شخص پر تو ظلم رہا۔ کیونکہ نہ تو اُسکو کچھ نقصان کا عوضانہ ملا اور نہ مجرم کو سزا ملی کہ اسکو تسلی ہوتی۔ مگر ان ساری باتوں میں سمجھ لینا چاہیئے کہ جب ہم ان پر ایسا گہرا غور کرتے ہیں۔ تو کیا اللہ تعالےٰ جو علیم اور خبیر ہے وہ ان سے درگزر کرسکتا ہے۔ وہ ضرور مظلوم کو حصہ دلائیگا خواہ مجرم کی نیکی سے یا اپنے فضل سے اور یہ بعید از قیاس نہیں۔ ہم اسی دنیا میں اسکی مثالیں پاتے ہیں۔

غرض اس قسم کے جملہ اعتراضات جہالت اور بدظنی اور ضد اور تعصب پر مبنی ہوتے ہیں اور ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اسلام ایسا مذہب قانون قدرت اور فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ کہ کسی طرف سے اس پر زد نہیں پڑتی۔ پاک باطن شخص قلب سلیم رکھنے والا اور صاحبِ لب یعنے ایسی عقل رکھنے والا جو بات کی تہ تک پہنچنی والی ہو۔ اسکو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالےٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم صحیح معنوں میں اسکی پیروی کرنے والے ہوں۔ آمین۔

ربا لخیر ختم شد ۱۱۱۱

منقول از سرمہ چشم آریہ

اے ز تعلیم وید آوارہ
منکر از فیض بخش ہموارہ

آن قدیرے کہ نسبت زو چارہ
نزد تو عاجز است و ناکارہ

بشنوی گر بود بحق روئے
شور قالوا بلیٰ ز ہر سوئے

آنکہ با ذاتِ او بقا و حیات
چوں نباشد بدیع ما آں ذات

ناتوانی ست طور مخلوقات
کے خدا اینچنیں بود ہیہات

کے پسندِ خرد کہ ربِّ قدیر
ناتواں باشد و ضعیف و حقیر

نظرے کن بشانِ ربّانی
داورے یا مکن بنادانی

اینچہ دین است و اینچہ آئین است
کہ خدا ناتوان و مسکین است

گر بدیں دین و کیش ہستی شاد
مایۂ عمر را دہی برباد

رسالہ گوشت خوری مولفہ مولف رسالہ ہذا

پر

چند قابل قدر رائیں

اخبار الحق دہلی ۔ ۲۔ دسمبر ۱۹۱۰ء منشی صاحب موصوف نے تین زبردست دلائل سے گوشت خوری کو ثابت کیا ہے۔ اور نیچر کے مطالعہ سے کام لیکر گوشت خوری کی تائید میں جو عنوان قائم کئے ہیں۔ انکو دیکھ کر کوئی آریہ مہاشہ معقول اور اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتا۔ منشی صاحب کا یہ دعوے کہ گوشت کھانا انسانی فطرت میں طبعی طور پر داخل ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اور اُسکو آپنے نیچرل طریقہ سے انسانی بناوٹ سے۔ اور حکم الہی سے ثابت کر دیا ہے۔ اہل ہنود گوشت خوری کی ممانعت میں جو امور پیش کیا کرتے ہیں۔ انکی خوب دھجیاں اُڑائی ہیں۔ غرض یہ چھوٹی سی کتاب ہر مسلمان کو غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔

جناب مولوی **فقیر محمد صاحب** بیجاپوری ۔ ۳۔ محرم ۱۳۲۸ ہجری ۔ یک رسالہ گوشت خوری مجھکو ملا جسکو دیکھکر مجھکو از حد خوشی حصول ہوئی ۔ یہ رسالہ مدلل بدلائل قویہ عقلیہ و نقلیہ معقول ہے۔ اور آپنے امت مرحومہ پر بڑا احسان کیا ہے۔ اب چار نسخے اسی رسالہ گوشت خوری کے ویلیو روانہ اِس پتہ پر فرمانا

جناب ابو الفاروق سید **محمد عسکری صاحب** ۔ ۴۔ نومبر ۱۹۱۱ء ۔ اُس کو بااستیعاب مطالعہ کر کے نہائیت درجہ خوشی اور مسرت ہوئی ۔ کہ آپنے نہایت قابلیت اور کامیابی کے ساتھ جواز گوشت خوری کو ثابت فرما دیا ہے ۔ اور نہائیت فصاحت کے ساتھ ہر ایک پوئنٹ پر بحث فرمائی ہے ۔ **الحمد للہ** کہ جیسے رسالہ کی اس مسئلہ پر میں عرصہ سے تلاش میں تھا ۔ وہ آپکی مساعی جمیلہ کی بدولت نصیب ہو گیا ۔ اللہ تعالے آپ کو جزائے خیر دے اور ہمیشہ تائید دین متین کی عطا فرماوے۔